ناصر کاظمی





Urdu Poetry Collection

ناصر کاظمی
ایک نظر میں

پیدائش	۸/دسمبر، ۱۹۲۵ء
	محلہ قاضی واڑہ، نیاز نبی بن بو علی بخش (نانا)
	کے گھر میں، کنیز منزل، انبالہ، ہریانہ، انڈیا
وفات	۲/مارچ، ۱۹۷۲ء، لاہور، پنجاب، پاکستان
عمر	۴۶ برس
تخلص	ناصر
پیدائشی نام	سیّد ناصر رضا کاظمی
پیشہ	شاعر، صحافی، مصنف،
	ریڈیو پاکستان میں اسٹاف ایڈیٹر
قومیت	پاکستانی
نژادیت	اردو
مادرِ علمی	نیشنل ہائی اسکول، پشاور
	ڈی۔ بی۔ مڈل اسکول، ڈاکشاہی
	مسلم ہائی اسکول، انبالہ
	اسلامیہ کالج، لاہور
	گورنمنٹ کالج لاہور
اصنافِ ادب	شاعری (غزل)
زوجہ	شفیقہ بانو (شفیقہ تسکین)
	بنتِ سیّد انوار الحق بن عبد العزیز
اولاد	دو بیٹے
	باصر سلطان کاظمی (ایم بی اے)
	حسن سلطان کاظمی
	تین پوتے پوتیاں
	ڈاکٹر وجاہت بصیر
	ارتضا حسن کاظمی
	آمنہ حسن کاظمی
اقرباء	کنیزہ محمدی (والدہ)
	سیّد محمد سلطان کاظمی بن شریف الحسن (والد)
	انصار رضا کاظمی (بھائی)

باصر سلطان کاظمی

ہم اپنے ادارے "بقا کریٹیوز" کی جانب سے جناب باصر سلطان کاظمی صاحب کے نہایت مشکور ہیں کہ انہوں نے ایپلیکیشن کی تیاری میں نہ صرف ہماری رہنمائی فرمائی، بلکہ محترم ناصر کاظمی صاحب کی بیشتر نایاب تصاویر فراہم کیں۔

معروف شاعر ناصر کاظمی کے بیٹے باصر سلطان کاظمی اس وقت برطانیہ کی بریڈ فورڈ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ باصر کاظمی نے ڈرامے لکھے، شاعری کی اور اردو ادب پر تنقید بھی لکھی ہے۔ پرانی نسل یعنی اپنے والد ناصر کاظمی کی نسل اور اپنی یعنی موجودہ دور کی نسل کے ادب کے تقابلی جائزے کے ذریعے ادب کے نئے رجحانات کی نشاندھی بھی کی ہے۔

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل، وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

باصر سلطان کاظمی صاحب کا مندرجہ بالا شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ دس دیگر زبانوں کے شعری نمونوں کے ساتھ پتھر پہ کندہ کر کے لندن سے ملحقہ شہر سلاؤ کے میکرای سکوائر میں نصب کیا گیا ہے۔ باصر سلطان کاظمی کو ادب ورثے میں مل تو گیا، اور بلاشک وشبہ جس ماحول میں پرورش پائی ہو گی وہ بھی نہایت موزوں ہو گا، تاکہ باصر سلطان کاظمی آج ادبی دنیا کے افق پر ایک ستارے کی مانند چمک سکیں۔ لیکن یقیناً ناصر کاظمی کا فرزند ہونا بھی اگر ایک جانب پذیرائی کا موجب ہے تو دوسری جانب نہایت اہم، بلکہ اہم ترین ذمہ داری کا باعث بھی ہے، اور اپنے والد محترم کا نام اور ساکھ قائم رکھنا ایک بہت بڑی اور بھاری ذمہ داری ہے۔

کیونکہ ادب کی روایت نہیں کہ کسی ادیب یا شاعر کا بیٹا بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے، آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارے ہاں بہت کم شعراء کے پسران عزیز ایسے ہیں جنہوں نے ادب کو قبول شوق عطا کیا ہو۔ لیکن ناصر کاظمی کے نزدیک ادب ایک اسلوب حیات تھا، اور یہ استثنیٰ بھی انہیں حاصل ہے کہ وہ اپنے ادبی اثاثے میں برگ نے، دیوان اور پہلی بارش جیسے لازوال شعری مجموعے ہی نہیں چھوڑ گئے بلکہ اپنا اسلوب حیات بھی اپنے بیٹے باصر سلطان کاظمی کو منتقل کر گئے ہیں۔

تخلیقی مزاج تو شاید باصر کاظمی صاحب کو گھٹی میں ہی مل گیا تھا، مگر اُن امیدوں پہ پورا اترنا جو ناصر کاظمی کے لختِ جگر پر ادبی دنیا لگائے بیٹھی تھی، کوئی کھیل نہیں تھا۔ لیکن قدرت نے باصر صاحب کو تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال کیا اور پھر انہوں نے اُن صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنایا اور، ایک شاعر کی حیثیت سے دنیاءِ ادب میں نمودار ہوئے، اور اس کے بعد پھر نثر کی طرف راغب ہوئے۔

باصر کاظمی شاعر، ڈرامہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک نام ہے، اور یہ نام یا یہ پہچان بننے سے پہلے، باصر صاحب نے 1976 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کیا، وہیں شعبہء انگریزی میں ڈرامہ اور تنقید پڑھاتے رہے۔ کالج ہی کے زمانے میں راوی میگزین کے مدیر بھی رہے۔ 1981 میں اپنے والد ناصر کاظمی کے منظوم ڈرامے سُر کی چھایا کا سیر حاصل تعارف لکھا، ناصر کاظمی ہی کے شعری مجموعے پہلی بارش کے تیسرے ایڈیشن کا دیباچہ تحریر کیا اور اس طرح نقاد کے طور پر سامنے آئے، اپنی پہلی ڈراموں پر مبنی کتاب 1987 میں بساط کے نام پر منظرِ عام پر آئی، 1990 میں برٹش کونسل کے سکالر شپ پر برطانیہ چلے آئے اور 1991 میں یونیورسٹی آف مانچسٹر سے ایجوکیشن میں ماسٹر ڈگری حاصل کی، جس کے حوالے سے انہوں نے ایک مقالہ The Education of women in Pakistan تحریر کیا۔ مشاعروں میں کئی دفعہ پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں، بی بی سی ریڈیو کے ایشین پروگراموں میں بھی معاونت کرتے رہے، north west play rights workshops کی جانب سے Writer-in-Residene کا ایوارڈ بھی ملا۔ اپنی کتاب بساط کا ترجمہ انگریزی میں The Chess Board کے نام سے شائع کیا۔ اور ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی تدریس کے حوالے سے پوسٹ گریجوشن کورس بھی کیا۔ پاکستان میں سو فیصد شرح خواندگی کے حصول کے بارے میں بھی کام کر رہے ہیں۔

قارئین محترم یہ سب کچھ آپ کو بتانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ناصر کاظمی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ اس جشن کے دلہا ہیں، وہ اعزاز تو انہیں حاصل ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود انہوں نے انتھک محنت کے عوض یہ مقام حاصل کیا ہے۔

اپنی محنت کے بل بوتے پر نثر نگاری، شاعری یا ڈرامہ نگاری ہی نہیں، بلکہ تمام اصنافِ ادب میں اپنی بھرپور چمک کے ساتھ، تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ ابتدا ہی میں جب جوہر آباد کالج کے مشاعرے میں غزل سنائی تو۔۔۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ناصر کاظمی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، تو صدر محفل ڈاکٹر صفدر حسین بولے، اس نوجوان کے اندر تو ناصر کاظمی کی روح نظر آتی ہے۔

محترم قارئین! میں ناچیز اتنی بڑی شخصیت کے بارے میں بھلا کیا کہہ یا لکھ سکتا ہوں، لیکن کچھ قد آور ادبی شخصیات کے الفاظ آپ سے شئیر ضرور کرنا چاہوں گا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے باصر کاظمی کی بصیرت اور کسی بھی موضوع پر فنی گرفت کو دل سے تحسین پیش کی ہے، اشفاق احمد صاحب، نے باصر صاحب کی تصنیف بساط پڑھنے کے بعد لکھا، یہ اردو ادب کے دو تین عظیم ڈراموں میں سے ایک ہے۔ اور پھر لکھا کہ مانوس اجنبی کی واردات سے متعارف ہونے کے بعد میرے دل نے کہا کہ ایسا اورائی اور مافوق ڈرامہ تو مجھے لکھنا چاہئے تھا۔۔۔ لیکن مانوس اجنبی نے یہ کہہ کر مجھے تسلی دی کہ تیرے پاس باصر کا قلم نہیں اور نہ ہی تیری برات ہے۔

باصر کاظمی کا مزاج فلسفیانہ ہے، ان کے تحریر کردہ ڈرامے میں، جدید فلسفیانہ رجحانات کی صدائیں سنائی دیتی ہیں، کہیں مادی فلسفے کے رنگ و آہنگ اور کہیں ماحول اور فضا میں کافکا اور کامیو کا لب ولہجہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جس خوش اسلوبی سے باصر کاظمی نے پرانی داستانوں کو نئے شعور کے ساتھ آمیز کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں، کیونکہ باصر صاحب کی تحریر اتنی جاندار اور بامعنی ہوتی ہے کہ ہر کہانی اپنے خالق کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

میرزا ادیب جیسے لوگوں نے بساط ڈرامے کے متعلق کہا کہ یہ بہت اعلیٰ درجے کا ادب پارہ ہے۔

اگر باصر کاظمی کی شعر گوئی پر نظر ڈالی جائے، تو ایک شعر جو ان کے کلام کی عکاسی کرتا ہے، پیشِ خدمت ہے۔

کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے جیسا لکھنا چاہا ویسا لکھا ہے

باصر سلطان کاظمی کا شعری سفر چار دہائیوں پر محیط ہے، ابتدائی سفر میرے خیال میں بڑا کٹھن گزرا، اس لئے کہ ناصر کاظمی جیسے بہت مقبول و معروف شاعر کی مہر باصر صاحب کے ماتھے پر ثبت تھی، یہاں تک کہ بعض اساتذہ اور شاعری سے شغف رکھنے والے طلبہ یہ سمجھتے تھے کہ باصر شاید اپنے نامور شاعر اور والد ناصر کاظمی سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ لیکن اس راہ پر انکی ثابت قدمی کام آئی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ باصر سلطان کاظمی اپنی پہچان آپ بنالے گا، اور باصر صاحب کا ایک شعر ہے

بنانا پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

باصر صاحب نے نہ تو روایتی حربوں سے کام لیا، نہ کسی آئنڈیالوجی سے فکر مستعار لی، نہ کسی نام نہاد روحِ عصر کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی، اور نہ کبھی کسی فیشن کی نقالی میں شعر کہے۔ بلکہ اپنے محسوسات، تخیلات اور تجربات کو موضوعِ سخن بنایا۔ ان کی شاعری کا منبع ان کی اپنی ذات اور باطن کی پکار ہے، لیکن خارجی دنیا کے احوال و وقائع سے با خبر، زندگی کے ہر رنگ اور انگ کے بارے میں رومانی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ باصر کاظمی کو اپنی ذات پر اعتماد ہے اس لئے انہوں نے مقبولیت کیلئے مروجہ بیساکھیوں کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ لیکن شاعری میں نہ صرف نئی زمینیں دریافت کی ہیں بلکہ اس میں نئی فصلیں بھی کاشت کی ہیں۔

نوے کی دہائی میں جب باصر صاحب تعلیم کے حصول کی خاطر انگلستان پہنچے تو، وہاں علمی اور ادبی سرگرمیوں میں بے حد مصروف ہو گئے۔ اُسی زمانے میں تعلیمی ڈگریوں کے علاوہ ادبی طور پر اتنے سرگرم رہے کہ آپ کے تصنیف کئے گئے ڈرامے تھیٹروں میں اسٹیج ہونے لگے، اور دوسری قوموں اور زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں سے بھی روابط استوار ہوئے۔ شاید اُسی زمانے میں لکھا ہو۔۔۔

حالت جگہ بدلنے سے بدلی نہیں میری
ہوتی ہیں ہر جگہ کی کچھ اپنی خرابیاں
ناصر کی شخصیت بھی عجب ہے کہ اس میں ہیں
کچھ خوبیاں خراب، کچھ اچھی خرابیاں

(بشکریہ راجہ شفیق کیانی، پاک نیوز)

ناصر کاظمی

سوانح عمری

سید ناصر رضا کاظمی، (1925-1972) پاکستان سے ایک اردو شاعر اور اس زمانے کا سب سے بڑا شاعروں میں سے ایک تھے، بالخصوص استعارے اور چھوٹی بہر کے استعمال میں ان کا ثانی کوئی نہیں ملتا- کاظمی انبالہ، ہریانہ میں 8 دسمبر 1925ء کو پیدا ہوئے.

تعلیم اور کیریئر

ناصر کاظمی نے انبالہ، شملہ کے بعد اسلامیہ کالج، لاہور میں تعلیم حاصل کی. وہ 1945 میں انبالہ واپس آئے اور آبائی زمین کی دیکھ بھال شروع کر دی. 1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد وہ لاہور تشریف لے آئے.

انہوں نے ایک ایڈیٹر کے طور پر "اوراق نو" کے ساتھ کچھ صحافتی کام کیا اور 1952 میں میگزین "ہمایوں" کے مدیر اعلی بن گئے. بعد میں وہ ریڈیو پاکستان لاہور اور دیگر ادبی مطبوعات اور تنظیموں کے ساتھ منسلک رہے.

ناصر کاظمی نے اختر شیرانی کے انداز پر عمل کرتے ہوئے 1940 میں شاعرانہ زندگی کا آغاز کیا اور رومانوی نظمیں اور sonnets لکھیں. بعد میں انہوں نے حفیظ ہوشیارپوری کی رہنمائی میں غزل لکھنا شروع کر دیا. انہوں نے کہا کہ میر تقی میر کا ایک بہت بڑا مداح تھا- ناصر کاظمی کی شاعری میں اداسی اور احساس محرومی کے جذبات یقیناً میر کا تاثر ہے- شاعری میں ان کے استاد حفیظ ہوشیارپوری نے بھی اپنے نظموں میں فطرت کی علامتوں کا استعمال کیا ہے.

انہوں نے اگست 1947ء میں انبالہ، بھارت سے لاہور، پاکستان ہجرت کی. انہوں نے ریڈیو پاکستان کے لئے ایک اسٹاف ایڈیٹر کے طور پر کام کیا. وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹی ہاؤس میں وقت بتایا کرتے یا لاہور، مال روڈ پر گھوما کرتے . انہیں گھومنے، اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ کھانے کا شوق تھا. عام طور پر وہ ایک دکھی شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں مگر ان کی شاعری حقیقت میں رومانوی خوشی اور امید کے پہلو پر مبنی ہے.

ان کی آخری چار کتابیں 2 مارچ 1972 کو لاہور میں پیٹ کے کینسر سے ان کی موت کے بعد شائع کی گئیں. موت سے چند روز پہلے انتظار حسین کے ساتھ ایک ٹی وی انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ... گاؤں میں میرا پسندیدہ مشغلہ گھومنا، گھڑسواری، شکار، پہاڑوں کا دورہ، دریا کے ساتھ چلنا وغیرہ تھے اور میرے ذہن میں فطرت سے محبت اور شاعری میں اظہار جذبات کرنے کے لئے شاید یہ وقت تھا-

میرے تمام مشاغل فنون لطیفہ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جیسے گانا، شاعری، شکار، شطرنج، پرندوں کی محبت، درختوں کی محبت وغیرہ... میں نے اسی وجہ سے شاعری شروع کی- میں تمام خوبصورت چیزیں جو میں دیکھتا ہوں جو میرے ہاتھ میں نہیں ہیں، اور وہ مجھ سے دور ہیں، انہیں اپنے کلام میں سمو سکوں. کچھ لمحات جو فوت ہو جائیں انہیں زندہ نہیں کیا جا سکتا. وہ سب شاعری میں زندہ ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے شاعری شروع کر دی"!

کتب

- برگ نئی (غزلیات 1952)،
- دیوان (غزلیات 1972)،
- پہلی بارش (1975)، غالب احمد کی طرف سے تعارف (1975) اور بشیر سلطان کاظمی (1983)،
- نشاط خواب (نظموں کا مجموعہ، 1977)،
- سر کی چھایا (منظوم ڈرامہ، کتھا، 1981)، تعارف، بشیر سلطان کاظمی
- خشک چشم کے کنارے (نثر، ترمیم بشیر سلطان کاظمی اور حسن سلطان کاظمی، 1982،: مضامین، ریڈیو فیچر، اداریے نئے ایڈیشن 1990، انتظار حسین، محمد حنیف رامے اور شیخ صلاح الدین کے ساتھ ناصر کی آخری انٹرویو اور ان کے ڈائیلاگ بھی شامل ہیں)
- ناصر کاظمی کی ڈائری (چند پریشاں کاغذ، حسن سلطان کاظمی نے مرتب کی، 1995)،
- انتخاب میر (شاعری)-بشیر سلطان کاظمی نے مرتب کی (1989)،
- انتخاب نظیر (شاعری)-بشیر سلطان کاظمی نے مرتب کی (1990)،
- انتخاب ولی دکنی (شاعری)-بشیر سلطان کاظمی نے مرتب کی (1991)،
- انتخاب انشاء (شاعری)-بشیر سلطان کاظمی نے مرتب کی (1991)،
- دیگر شعرا کے انتخاب

آئینہ لے صبا پھر آئی

آئینہ لے لے صبا پھر آئی
بجھتی آنکھوں میں ضیا پھر آئی

تازہ رس لمحوں کی خوشبو لے کر
گُل زمینوں کی ہوا پھر آئی

سرمئی دیس کے سپنے لے کر
شبنم زمزمہ پا پھر آئی

پھر چمکنے لگیں سونی راہیں
ساربانوں کی صدا پھر آئی

پھر کوئی قافلہ گزرا تھا یہاں
وہی آوازِ درا پھر آئی

ناصر کاظمی



آج تو بے سبب اداس ہے جی

آج تو بے سبب اداس ہے جی
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی

جلتا پھرتا ہوں میں دوپہروں میں
جانے کیا چیز کھو گئی میری

وہیں پھرتا ہوں میں بھی خاک بسر
اس بھرے شہر میں ہے ایک گلی

چھپتا پھرتا ہے عشق دنیا سے
پھیلتی جارہی ہے رسوائی

ہم نشیں کیا کہوں کہ وہ کیا ہے
چھوڑ یہ بات نیند اڑنے لگی

آج تووہ بھی کچھ خموش سا تھا
میں نے بھی اُس سے کوئی بات نہ کی

ایک دم اُس کے ہونٹ چوم لیے
یہ مجھے بیٹھے بیٹھے کیا سوجی

اک دم اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا
جانے کیا بات درمیاں آئی

تو جو اتنا اداس ہے ناصر
تجھے کیا ہو گیا بتا تو سہی

ناصر کاظمی



آرائشِ خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو

آرائشِ خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

دیوانگیء شوق کو یہ دھن ہے کہ ان دِنوں
گھر بھی ہو اور بے درودیوارسا بھی ہو

جز دل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ رہے درکھلا بھی ہو

ہر ذرہ ایک محملِ عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاوں کوئی دیکھتا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پسِ پردہء سکوت
لیکن کسے سناوں کوئی ہم نوا بھی ہو

فرصت میں سن شگفتگیء غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لیے
طاوس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ناصر کاظمی



آنکھوں میں ہیں دکھ بھرے فسانے

آنکھوں میں ہیں دکھ بھرے فسانے
رونے کے پھر آ گئے زمانے

پھر درد نے آگ راگ چھیڑا
لَوٹ آئے وہی سمے پُرانے

پھر چاند کو لے اڑی ہوائیں
پھر بانسری چھیڑ دی ہوا نے

رستوں میں اداس خوشبوؤں کے
پھولوں نے لٹا دیے خزانے

ناصر کاظمی



آہ پھر نغمہ بنا چاہتی ہے

آہ پھر نغمہ بنا چاہتی ہے
خامشی طرزِ ادا چاہتی ہے

آج پھر وسعتِ صحرائے جنوں
پرسشِ آبلہ پا چاہتی ہے

دیکھ کیفیّتِ طوفانِ بہار
بوئے گل رنگِ ہوا چاہتی ہے

موت آرائشِ ہستی کے لئے
خندۂ زخمِ وفا چاہتی ہے

دل میں اب خارِ تمنّا بھی نہیں
زندگی برگ و نوا چاہتی ہے

سوچ اے دشمنِ اربابِ وفا
کیوں تجھے خلقِ خدا چاہتی ہے

اک ہمیں بارِ چمن ہیں ورنہ
غنچے غنچے کو صبا چاہتی ہے

ناصر کاظمی



اب اُن سے اور تقاضائے بادہ کیا کرتا

اب اُن سے اور تقاضائے بادہ کیا کرتا
جو مل گیا ہے میں اُس سے زیادہ کیا کرتا

بھلا ہوا کہ ترے راستے کی خاک ہوا
میں یہ طویل سفر پا پیادہ کیا کرتا

مسافروں کی تو خیر اپنی اپنی منزل تھی
تری گلی کو نہ جاتا تو جادہ کیا کرتا

تجھے تو گھیرے ہی رہتے ہیں رنگ رنگ کے لوگ
ترے حضور مرا حرفِ سادہ کیا کرتا

بس ایک چہرہ کتابی نظر میں ہے ناصر
کسی کتاب سے میں استفادہ کیا کرتا

ناصر کاظمی



اپنی دھن میں رہتا ہوں

اپنی دھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں

او پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں

تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں

مجھ سے آنکھ ملائے کون
میں تیرا آئینہ ہوں

میرا دیا جلائے کون
میں ترا خالی کمرہ ہوں

تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں ترے تن کا کپڑا ہوں

تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

آتی رت مجھے روئے گی
جاتی رت کا جھونکا ہوں

اپنی لہر ہے اپنا روگ
دریا ہوں اور پیاسا ہوں

ناصر کاظمی



اداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی

اداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی

بہار ایک خلش سی دلوں میں چھوڑ گئی

بچھڑ کے تجھ سے ہزاروں طرف خیال گیا

تری نظر مجھے کن منزلوں میں چھوڑ گئی

کہاں سے لائیے اب اُس نگاہ کو ناصر

جو ناتمام امنگیں دلوں میں چھوڑ گئی

ناصر کاظمی



اِس دنیا میں اپنا کیا ہے

اس دنیا میں اپنا کیا ہے
کہنے کو سب کچھ اپنا ہے

یوں تو شبنم بھی دریا ہے
یوں تو دریا بھی پیاسا ہے

یوں تو ہر ہیرا بھی کنکر
یوں تو مٹی بھی سونا ہے

منہ دیکھے کی باتیں ہیں سب
کس نے کس کو یاد کیا ہے

تیرے ساتھ گئی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے

بات نہ کر صورت تو دکھا دے
تیرا اس میں کیا جاتا ہے

دھیان کے آتش دان میں ناصر
بجھے دِنوں کا ڈھیر پڑا ہے

ناصر کاظمی



اس سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے

اس سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ کہتی ہیں
یہ خاموشی، آواز نما کچھ کہتی ہے

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوئے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامانوس اداس نوا کچھ کہتی ہے

جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے

کبھی بھور بھئے کبھی شام پڑے کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے

مہمان ہیں ہم مہمان سرائے یہ نگری
مہمانوں کو مہمان سرا کچھ کہتی ہے

بیدار رہو بیدار رہو بیدار رہو
اے ہم سفرو آوازِ ردا کچھ کہتی ہے

ناصر آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

ناصر کاظمی



او میرے مصروف خدا

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سنّاٹا
جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا ایک دیا
خاک اڑاتے ہیں دن رات
میلوں پھیل گئے صحرا
زاغ و زغن کی چیخوں سے
سونا جنگل چیخ اُٹھا
پیاسی دھرتی جلتی ہے
سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا
او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

ناصر کاظمی



اوّلیں چاند نے کیا بات سُجھائی مجھ کو

اوّلیں چاند نے کیا بات سُجھائی مجھ کو
یاد آئی تری انگشتِ حنائی مجھ کو

سرِ ایوانِ طرب نغمہ سرا تھا کوئی
رات بھر اس نے تری یاد دلائی مجھ کو

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

انہی آنکھوں نے دکھائے کئی بھر پور جمال
انھیں آنکھوں نے شبِ ہجر دکھائی مجھ کو

سائے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج و الم
گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو

دھوپ اُدھر ڈھلتی تھی۔ دل ڈوب اِدھر جاتا تھا
آج تک یاد ہے وہ شامِ جدائی مجھ کو

شہرِ لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

ناصرِ کاظمی



ایک نگر میں ایسا دیکھا دن بھی جہاں اندھیر

ایک نگر میں ایسا دیکھا دن بھی جہاں اندھیر
پچھلے پہر یوں چلے اندھیری جیسے گرجیں شیر

ہوا چلی تو پنکھ پنکھیرو بستی چھوڑ گئے
سونی رہ گئی کنگنی، خالی ہوئے منڈیر

بچپن میں بھی وہی کھلاڑی بنا ہے اپنا میت
جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری بیر

یارو تم تو ایک ڈگر پر ہار کے بیٹھ گئے
ہم نے تپتی دھوپ میں کاٹے کڑے کوس کے پھیر

اب تو اس دیس میں یوں آیا سیلاب
کب کی کھڑی حویلیاں پل میں ہو گئیں ڈھیر

ناصر کاظمی



اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی

اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی
میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں تو اپنے ہونٹ سی

کن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کی نور نہ باتوں میں تازگی

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

گلیوں میں اب تو شام سے پھرتے ہیں پہرہ دار
ہے کوئی کوئی شمع سو وہ بھی بجھی بجھی

اے روشنئ دیدہ و دل اب نظر بھی آ
دنیا ترے فراق میں اندھیر ہو گئی

القصّہ جیب چاک ہی کرنی پڑی ہمیں
گو ابتدائے غم میں بڑی احتیاط کی

اب جی میں ہے کہ سر کسی پتھر سے پھوڑیے
ممکن ہے قلبِ سنگ سے نکلے کوئی پری

بیکار بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کوئی دن
تصویر کھینچیے کسی موجِ خیال کی

ناصر بہت سی خواہشیں دل میں ہیں بے قرار
لیکن کہاں سے لاؤں وہ بے فکر زندگی

ناصر کاظمی

بدلی نہ اس کی روح کسی انقلاب میں

بدلی نہ اس کی روح کسی انقلاب میں
کیا چیز زندہ بند ہے دل کے رباب میں

لفظوں میں بولتا ہے رگِ عصر کا لہو
لکھتا ہے دستِ غیب کوئی اس کتاب میں

تو ڈھونڈتی ہے اب کسے اے شامِ زندگی
دو دن تو خرچ ہو گئے غم کے حساب میں

یارانِ زُود نشّہ کا عالم یہ ہے کہ آج
یہ رات ڈوب جائے گی جامِ شراب میں

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں

یہ آج راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ
یہ خواب میں نے رات ہی دیکھا تھا خواب میں

ناصر کاظمی



برف گرتی رہے آگ جلتی رہے

برف گرتی رہے آگ جلتی رہے
آگ جلتی رہے رات ڈھلتی رہے

رات بھر ہم یونہی رقص کرتے رہیں
نیند تنہا کھڑی ہاتھ ملتی رہے

برف کے ہاتھ پیانو بجاتے رہیں
جام چلتے رہیں مے اچھلتی رہے

ناصر کاظمی



بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بلا رہی ہے ابھی تک وہ دل نشیں آواز

وہی دلوں میں تپش ہے، وہی شبوں میں گداز
مگر یہ کیا کہ مری زندگی میں سوز نہ ساز

نہ چھیڑ اے خلشِ درد، بار بار نہ چھیڑ
چھپائے بیٹھا ہوں سینے میں ایک عمر کا راز

بس اب تو ایک ہی دھن ہے کہ نیند آ جائے
وہ دن کہاں کہ اٹھائیں شبِ فراق کے ناز

گزر ہی جائے گی اے دوست تیرے ہجر کی رات
کہ تجھ سے بڑھ کے تیرا درد ہے مرا ہم ساز

یہ اور بات کہ دنیا نہ سن سکی ورنہ
سکوتِ اہلِ نظر ہے بجائے خود آواز

یہ بے سبب نہیں شام و سحر کے ہنگامے
اٹھا رہا ہے کوئی پردہ ہائے راز و نیاز

ترا خیال بھی تیری طرح مکمّل ہے
وہی شباب، وہی دل کشی، وہی انداز

شراب و شعر کی دنیا بدل گئی لیکن
وہ آنکھ ڈھونڈ ہی لیتی ہے بے خودی کا جواز

عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصر
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

ناصر کاظمی



بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے
یہ ہم سفر مرے کتنے گریز پا نکلے

چلے تھے اور کسی راستے کی دھن میں مگر
ہم اتفاق سے تیری گلی میں آ نکلے

غمِ فراق میں کچھ دیر رو ہی لینے دو
بخار کچھ تو دلِ بے قرار کا نکلے

نصیحتیں ہمیں کرتے ہیں ترکِ الفت کے
یہ خیر خواہ ہمارے کدھر سے آ نکلے

یہ خامشی تو رگ پے میں رچ گئی ناصر
وہ نالہ کر کہ دلِ سنگ سے صدا نکلے

ناصر کاظمی



بے حجابانہ انجمن میں آ

بے حجابانہ انجمن میں آ
کم سخن محفلِ سخن میں آ

اے مرے آہوئے رمیدہ کبھی
دل کے اجڑے ہوئے خُتن میں آ

دل کہ تیرا تھا، اب بھی تیرا ہے
پھر اسی منزلِ کہن میں آ

اے گلستانِ شب کے چشم و چراغ
کبھی اجڑے دلوں کے بَن میں آ

کبھی فرصت ملے تو پچھلے پہر
شب گزیدوں کی انجمن میں آ

صبحِ نورس کی آنکھ کے تارے
چاند مرجھا گیا گہن میں، آ

رنگ بھر دے اندھیری راتوں میں
جانِ صبحِ وطن! وطن میں آ

پھول جھڑنے کی شام آ پہنچی
نو بہارِ چمن! چمن میں آ

ناصر کاظمی



بے منّتِ خضرِ راہ رہنا

بے منّتِ خضرِ راہ رہنا
منظور ہمیں تباہ رہنا

یاروں کو نصیبِ سرفرازی
مجھ کو تری گردِ راہ رہنا

دل ایک عجیب گھر ہے پیارے
اس گھر میں بھی گاہ گاہ رہنا

گر یوں ہی رہ دلوں کی رنجش
مشکل ہے بہم نباہ رہنا

بھر آئے گی آنکھ بھی کسی دن
خالی نہیں صرفِ آہ رہنا

میں ہاتھ نہیں اسے لگایا
اے بے گنہی گواہ رہنا

ناصر یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

ناصر کاظمی



پل پل کانٹا سا چبھتا تھا

پل پل کانٹا سا چبھتا تھا
یہ ملنا بھی کیا ملنا تھا
کانٹوں کے ویراں جنگل میں
میں کس مشکل سے پہنچا تھا
یہ جنگل اور تیری خوشبو
کیا میں سپنا دیکھ رہا تھا؟
آج وہ آنکھیں بجھی بجھی تھیں
میں جنھیں پہروں ہی تکتا تھا
کتنی باتیں کی تھیں لیکن
ایک بات سے جی ڈرتا تھا
تیرے ہاتھ کی چائے تو پی تھی
دل کا رنج تو دل میں رہا تھا
میں بھی مسافر، تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا
تو نے بھی کوئی بات نہ پوچھی
میں بھی تجھے کچھ کہہ نہ سکا تھا
اک اجڑے سے اسٹیشن پر
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا
تیرے شہر کا اسٹیشن بھی
میرے دل کی طرح سونا تھا
کیسے کہوں روداد سفر کی
آگے موڑ جدائی کا تھا

ناصر کاظمی



پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے

پھر کاگا بولا گھر کے سونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے

پہلے تو میں چیخ کے رویا اور پھر ہنسنے لگا
بادل گرجا بجلی چمکی تم یاد آئے

دن بھر تو میں دنیا کے دھندوں میں کھویا رہا
جب دیواروں سے دھوپ ڈھلی تم یاد آئے

ناصر کاظمی



پھر لہو بول رہا ہے دل میں

پھر لہو بول رہا ہے دل میں
دم بدم کوئی صدا ہے دل میں

تاب لائیں گے نہ سننے والے
آج وہ نغمہ چھڑا ہے دل میں

ہاتھ مَلتے ہی رہیں گے گل چیں
آج وہ پھول کھلا ہے دل میں

دشت بھی دیکھے چمن بھی دیکھا
کچھ عجب آب و ہوا ہے دل میں

رنج بھی دیکھے خوشی بھی دیکھی
آج کچھ درد نیا ہے دل میں

چشم تر ہی نہیں محوِ تسبیح
خوں بھی سرگرمِ دعا ہے دل میں

پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی
کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں

پھر کسی غم نے پکارا شاید
کچھ اجالا سا ہوا ہے دل میں

کہیں چہرے کہیں آنکھیں کہیں ہونٹ
اک صنم خانہ کھلا ہے دل میں

اُسے ڈھونڈا وہ کہیں بھی نہ ملا
وہ کہیں بھی نہیں یا ہے دل میں

کیوں بھٹکتے پھریں دل سے باہر
دوستو شہر بسا ہے دل میں

کوئی دیکھے تو دکھاؤں ناصر
وسعتِ ارض و سما ہے دل میں

ناصر کاظمی



پھر نئی فصل کے عنواں چمکے

پھر نئی فصل کے عنواں چمکے
ابر گرجا گلِ باراں چمکے

آنکھ جھپکوں تو شرارے برسیں
سانس کھینچوں تو رگِ جاں چمکے

کیا بگڑ جائے گا اے صبحِ جمال
آج اگر شامِ غریباں چمکے

اے فلک بھیج کوئی برقِ خیال
کچھ تو شامِ شبِ ہجراں چمکے

پھر کوئی دل کو دکھائے ناصر
کاش یہ گھر کسی عنواں چمکے

ناصر کاظمی



پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے

پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے
یارو یہ کیسی ہوا ہے اب کے

دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر
یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے

پتّیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتلِ گل عام ہوا ہے اب کے

شفقی ہو گئی دیوارِ خیال
کس قدر خون بہا ہے اب کے

منظرِ زخمِ وفا کس کو دکھائیں
شہر میں قحطِ وفا ہے اب کے

وہ تو پھر غیر تھے لیکن یارو
کام اپنوں سے پڑا ہے اب کے

کیا سنیں شورِ بہاراں ناصر
ہم نے کچھ اور سنا ہے اب کے

ناصر کاظمی



پہنچے گور کنارے ہم

پہنچے گور کنارے ہم
بس غمِ دوراں ہارے ہم

سب کچھ ہار کے رستے میں
بیٹھ گئے دکھیارے ہم

ہر منزل سے گزرے ہیں
تیرے غم کے سہارے ہم

دیکھ خیالِ خاطرِ دوست
بازی جیت کے ہارے ہم

آنکھ کا تارا آنکھ میں ہے
اب نہ گنیں گے تارے ہم

ناصر کاظمی



تارے گنوائے یا سحر دکھلائے

تارے گنوائے یا سحر دکھلائے
دیکھیے شامِ غم کہاں لے جائے

صبحِ نو رس کا راگ سنتے ہی
شبِ گل کے چراغ مرجھائے

صبح نکلے تھے فکرِ دنیا میں
خانہ برباد دن ڈھلے آئے

کیوں نہ اس کم نما کو چاند کہوں
چاند کو دیکھ کر جو یاد آئے

ناصر کاظمی



تجھے کہنا ہے کچھ مگر خاموش

تجھے کہنا ہے کچھ مگر خاموش
دیکھ اور دیکھ کے گزر خاموش

یوں ترے راستے میں بیٹھا ہوں
جیسے اک شمعِ رہگزر خاموش

تو جہاں ایک بار آیا تھا
ایک مدت سے ہے وہ گھر خاموش

اس گلی کے گزرنے والوں کو
تکتے رہتے ہیں بام و در خاموش

اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش

شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش

اب کے بیڑا گزر گیا تو کیا
ہیں ابھی کتنے ہی بھنور خاموش

چڑھتے دریا کا ڈر نہیں یارو
میں ہوں ساحل کو دیکھ کر خاموش

ابھی وہ قافلے نہیں آئے
ابھی بیٹھیں نہ ہم سفر خاموش

ہر نفس اک پیام تھا ناصر
ہم ہی بیٹھے رہے مگر خاموش

ناصر کاظمی



ترے آنے کا دھوکہ سا رہا ہے

ترے آنے کا دھوکہ سا رہا ہے
دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے

عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے

سنا ہے رات بھر برسا ہے بادل
مگر وہ شہر جو پیاسا رہا ہے

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

کسے ڈھونڈو گے ان گلیوں میں ناصر
چلو اب گھر چلیں دن جا رہا ہے

ناصر کاظمی



ترے خیال سے لَو دے اٹھی ہے تنہائی

ترے خیال سے لَو دے اٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

تو کس خیال میں ہے منزلوں کے شیدائی
اُنھیں بھی دیکھ جِنھیں راستے میں نیند آئی

پُکار اے جرسِ کاروانِ صبحِ طرب
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں تیرے سودائی

ٹھہر گئے ہیں سرِ راہ خاک اُڑانے کو
مسافروں کو نہ چھیڑ اے ہوائے صحرائی

رہِ حیات میں کچھ مرحلے تو دیکھ لیے
یہ اور بات تری آرزو نہ راس آئی

یہ سانحہ بھی محبّت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اُٹھا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

جہاں بھی تھا کوئی فتنہ تڑپ کے جاگ اُٹھا
تمام ہوش تھی مستی میں تیری انگڑائی

کھُلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے، نہ وہ جلسے، نہ شہر رعنائی

وہ تابِ درد وہ سودائے انتظار کہاں
اُنھی کے ساتھ گئی طاقتِ شکیبائی

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

ناصر کاظمی



ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں

ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں
مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی
کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

کہاں تک لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

نگاہِ یاس کو نیند آ رہی ہے
مژہ پر اشک بوجھل ہو گئے ہیں

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

ناصر کاظمی



تم آ گئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں

تم آ گئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں

خلوص و مہر وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
مرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں

یہ خاص و عام کی بیکار گفتگو کب تک
قبول کیجیے جو فیصلہ عوام کریں

ہر آدمی نہیں شائستۂ رموزِ سخن
وہ کم سخن ہو مخاطب تو ہم کلام کریں

جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشیوں کا انتظام کریں

رہِ طلب میں جو گمنام مر گئے ناصر
متاعِ درد انہی ساتھیوں کے نام کریں

ناصر کاظمی



تنہا عیش کے خواب نہ بُن

تنہا عیش کے خواب نہ بُن
کبھی ہماری بات بھی سُن
تھوڑا غم بھی اُٹھا پیارے
پھول چُنے ہیں خار بھی چُن
سکھ کی نیندیں سونے والے
محرومی کے راگ بھی سُن

تنہائی میں تیری یاد
جیسے ایک سُریلی دھُن
جیسے چاند کی ٹھنڈی لَو
جیسے کرنوں کی کُن مُن
جیسے جل پریوں کا ناچ
جیسے پائل کی جھُن جھُن

ناصر کاظمی



تو اسیر بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالۂ نَے نہیں

تو اسیر بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالۂ نَے نہیں
ترا دل گداز ہو کس طرح یہ ترے مزاج کی لے نہیں

ترا ہر کمال ہے ظاہری ترا ہر خیال ہے سرسری
کوئی دل کی بات کروں تو کیا ترے دل میں آگ تو ہے نہیں

جسے سن کے روح مہک اٹھے جسے پی کے درد چہک اٹھے
ترے ساز میں وہ صدا نہیں ترے میکدے میں وہ مے نہیں

کہاں اب وہ موسمِ رنگ و بو کہ رگوں میں بول اٹھے لہو
یونہی ناگوار چبھن سی ہے کہ جو شاملِ رگ و پے نہیں

ترا دل ہو درد سے آشنا تو یہ نالہ غور سے سن ذرا
بڑا جاں گسل ہے یہ واقعہ یہ فسانۂ جم و کَے نہیں

میں ہوں ایک شاعرِ بے نوا مجھے کون چاہے مرے سوا
میں امیر شام و عجم نہیں میں کبیر کوفہ و رَے نہیں

یہی شعر ہیں مری سلطنت اسی فن میں ہے مجھے عافیت
مرے کاسۂ شب و روز میں ترے کام کی کوئی شے نہیں

ناصر کاظمی



تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں؟

تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں؟
کہ راہ میں شجرِ سایہ دار بھی تو نہیں

فلک نے پھینک دیا برگِ گل کی چھاؤں سے دور
وہاں پڑے ہیں جہاں خارزار بھی تو نہیں

جو زندگی ہے تو بس تیرے درد مندوں کی
یہ جبر بھی تو نہیں، اختیار بھی تو نہیں

وفا ذریعۂ اظہارِ غم سہی ناصر
یہ کاروبار کوئی کاروبار بھی تو نہیں

ناصر کاظمی



تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانکپن

تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانکپن
تیری گلی گلی کی خیر اے مرے دل رُبا وطن

وہ تو بس ایک موج تھی آئی ادھر اُدھر گئی
آنکھوں میں ہے مگر ابھی رات کے خواب کی تھکن

پھر وہی دشتِ بے اماں پھر وہی رنجِ رائیگاں
دل کو جگا کے سو گئی تیرے خیال کی کرن

آیا گیا نہ میں کہیں صبح سے شام ہو گئی
جلنے لگے ہیں ہاتھ کیوں ٹوٹ رہا ہے کیوں بدن

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میّتِ شہر بے کفن

میکدہ بجھ گیا تو کیا رات ہے میری ہمنوا
سایہ ہے میرا ہم سبو چاند ہے میرا ہم سخن

دل ہے مرا لہو لہو تاب نہ لا سکے گا تو
اے مرے تازہ ہمنشیں تو مرا ہم سبو نہ بن

ناصر کاظمی



تو ہے یا تیرا سایا ہے

تو ہے یا تیرا سایا ہے
بھیس خدائی نے بدلا ہے

دل کی حویلی پر مدت سے
خاموشی کا قفل پڑا ہے

چیخ رہے ہیں خالی کمرے
شام سے کتنی تیز ہوا ہے

دروازے سر پھوڑ رہے ہیں
کون اس گھر کو چھوڑ گیا ہے

تنہائی کو کیسے چھوڑوں
برسوں میں ایک یار ملا ہے

رات اندھیری ناو ساتھی
رستے میں دریا پڑتا ہے

ہچکی تھمتی ہی نہیں ناصر
آج کسی نے یاد کیا ہے

ناصر کاظمی



تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی

تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی
آنکھ کہتی ہے ترے دل میں طلب ہے کوئی

آنچ آتی ہے ترے جسم کی عریانی سے
پیرہن ہے کہ سلگتی ہوئی شب ہے کوئی

ہوش اُڑانے لگیں پھر چاند کی ٹھنڈی کرنیں
تیری بستی میں ہوں یا خوابِ طرب ہے کوئی

گیت بُنتی ہے ترے شہر کی بھرپور ہوا
اجنبی میں ہی نہیں تو بھی عجب ہے کوئی

لیے جاتی ہیں کسی دھیان کی لہریں ناصر
دور تک سلسلۂ تاکِ طرب ہے کوئی

ناصر کاظمی



ٹھہرا تھا وہ گل عذار کچھ دیر

ٹھہرا تھا وہ گل عذار کچھ دیر
بھرپور رہی بہار کچھ دیر

اک دھوم رہی گلی گلی میں
آباد رہے دیار کچھ دیر

پھر جھوم کے بستیوں پہ برسا
ابرِ سرِ کوہسار کچھ دیر

پھر لالہ و گل کے مے کدوں میں
چھلکی مئے مشکبار کچھ دیر

پھر نغمہ و مے کی صحبتوں کا
آنکھوں میں رہا خمار کچھ دیر

پھر شامِ وصالِ یار آئی
بہلا غمِ روزگار کچھ دیر

پھر جاگ اُٹھے خوشی کے آنسو
پھر دل کو ملا قرار کچھ دیر

پھر ایک نشاطِ بے خودی میں
آنکھیں رہیں اشک بار کچھ دیر

پھر ایک طویل ہجر کے بعد
صحبت رہی خوشگوار کچھ دیر

پھر ایک نگار کے سہارے
دنیا رہی سازگار کچھ دیر

ناصر کاظمی



جب تک نہ لہو دیدۂ انجم میں ٹپک لے

جب تک نہ لہو دیدۂ انجم میں ٹپک لے
اے دل قفسِ جاں میں ذرا اور پھڑک لے

ذرّے ہیں ہوس کے بھی زرِناب وفا میں
ہاں جنسِ وفا کو بھی ذرا چھان پھٹک لے

پھر دیکھنا اُس کے لبِ لعلیں کی ادائیں
یہ آتشِ خاموش ذرا اور دہک لے

گونگا ہے تو لب بستوں سے آدابِ سخن سیکھ
اندھا ہے تو ہم ظلم رسیدوں سے چمک لے

ناصر سے کہے کون کہ اللہ کے بندے
باقی ہے ابھی رات ذرا آنکھ جھپک لے

ناصر کاظمی



جب ذرا تیز ہوا ہوتی ہے

جب ذرا تیز ہوا ہوتی ہے
کیسی سنسان فضا ہوتی ہے
ہم نے دیکھے ہیں وہ سناّٹے بھی
جب ہر اک سانس صدا ہوتی ہے
دل کا یہ حال ہوا تیرے بعد
جیسے ویران سرا ہوتی ہے
رونا آتا ہے ہمیں بھی لیکن
اس میں توہینِ وفا ہوتی ہے
منہ اندھیرے کبھی اُٹھ کر دیکھو
کیا تروتازہ ہوا ہوتی ہے
اجنبی دھیان کی ہر موج کے ساتھ
کس قدر تیز ہوا ہوتی ہے
غم کی بے نور گزر گاہوں میں
اک کرن ذوق فزا ہوتی ہے
غمگسارِ سفرِ راہِ وفا
مژۂ آبلہ پا ہوتی ہے
گلشنِ فکر کی منہ بند کلی
شبِ مہتاب میں وا ہوتی ہے
جب نکلتی ہے نگارِ شبِ غم
منہ پہ شبنم کی ردا ہوتی ہے
حادثہ ہے کہ خزاں سے پہلے
بوئے گل ، گل سے جدا ہوتی ہے
اک نیا دور جنم لیتا ہے
ایک تہذیب فنا ہوتی ہے
جب کوئی غم نہیں ہوتا ناصر
بے کلی دل کی سوا ہوتی ہے

ناصر کاظمی

جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند

جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

زلفِ شب رنگ کے صد راہوں میں
میں نے دیکھا ہے طلسمات کا چاند

رس کہیں روپ کہیں رنگ کہیں
ایک جادو ہے ملاقات کا چاند

ناصر کاظمی



جبیں پہ دھوپ سی آنکھوں میں کچھ حیا سی ہے

جبیں پہ دھوپ سی آنکھوں میں کچھ حیا سی ہے
تو اجنبی ہے مگر شکل آشنا سی ہے

خیال ہی نہیں آتا کسی مصیبت کا
ترے خیال میں ہر بات غم ربا سی ہے

جہاں میں یوں تو کسے چین ہے مگر پیارے
یہ تیرے پھول سے چہرے پہ کیوں اداسی ہے

دلِ غمیں سے بھی جلتے ہیں شادمانِ حیات
اسی چراغ سے اب شہر میں ہوا سی ہے

ہمیں سے آنکھ چُراتا ہے اس کا ہر ذرہ
مگر یہ خاک ہمارے ہی خوں کی پیاسی ہے

اداس پھرتا ہوں میں جس کی دھن میں برسوں سے
یونہی سی ہے وہ خوشی بات وہ ذرا سی ہے

چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اداسی ہے

ناصر کاظمی



جرمِ انکار کی سزا ہی دے

جرمِ انکار کی سزا ہی دے
میرے حق میں بھی کچھ سنا ہی دے

شوق میں ہم نہیں زیادہ طلب
جز ترا نازِ کم نگاہی دے

تو نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
مجھ کو اک اشکِ صبح گاہی دے

تو نے بنجر زمیں کو پھول دیے
مجھ کو اک زخمِ دل کشا ہی دے

بستیوں کو دیے ہیں تو نے چراغ
دشتِ دل کو بھی کوئی راہی دے

عمر بھر کی نواگری کا صلہ
اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے

زرد رو ہیں ورق خیالوں کے
اے شبِ ہجر کچھ سیاہی دے

گر مجالِ سخن نہیں ناصر
لبِ خاموش سے گواہی دے

ناصر کاظمی



جنت ماہی گیروں کی

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیروں کی
اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی
کڑوے خواب غریبوں کے
میٹھی نیند امیروں کی
رات گئے تیری یادیں
جیسے بارش تیروں کی
مجھ سے باتیں کرتی ہیں
خاموشی تصویروں کی
ان ویرانوں میں ناصر
کان دبی ہے ہیروں کی

ناصر کاظمی



جہاں تیرے غم نے قدم رکھ دیا

جہاں تیرے غم نے قدم رکھ دیا
سرِ طاق دنیا کا غم رکھ دیا

دکھا کر ہمیں دو جہانوں کے خواب
دلوں میں غمِ بیش و کم رکھ دیا

سحر دم فلک نے مرے سامنے
بجائے سبو، خوانِ غم رکھ دیا

برستے ہیں اطراف سے ہم پہ تیر
یہ کس راستے میں قدم رکھ دیا

ذرا دیکھ تو اے قسیمِ ازل
یہ کس ہاتھ پر جامِ جم رکھ دیا

ناصر کاظمی



جو گفتنی نہیں وہ بات بھی سنادوں گا

جو گفتنی نہیں وہ بات بھی سنادوں گا
تو ایک بار تو مل، سب گلے مٹادوں گا

مجال کیا، کوئی مجھ سے تجھے جدا کر دے
جہاں بھی جائے گا تو میں تجھے صدا دوں گا

تری گلی میں بہت دیر سے کھڑا ہوں مگر
کسی نے پوچھ لیا تو جواب کیا دوں گا

مری خموش نگاہوں کو چشم کم سے نہ دیکھ
میں رو پڑا تو دلوں کے طبق ہلا دوں گا

یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا

بہ پاس صحبتِ دیرینہ کوئی بات ہی کر
نظر ملا تو سہی میں تجھے دعا دوں گا

بلاؤں گا نہ ملوں گا نہ خط لکھوں گا تجھے
تری خوشی کے لیے خود کو یہ سزا دوں گا

وہ درد ہی نہ رہا ورنہ اے متاعِ حیات
مجھے گماں بھی نہ تھا میں تجھے بھلا دوں گا

ابھی تو رات ہے کچھ دیر سو ہی لے ناصر
کوئی بلائے گا تو میں تجھے جگا دوں گا

ناصر کاظمی



چمن در چمن وہ رمق اب کہاں

چمن در چمن وہ رمق اب کہاں
وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں

کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں
وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں

بجھی آتشِ گل، اندھیرا ہوا
وہ اجلے سنہرے ورق اب کہاں!

برابر ہے ملنا نہ ملنا ترا
بچھڑنے کا تجھ سے قلق اب کہاں

ناصر کاظمی



چند گھرانوں نے مل جل کر

چند گھرانوں نے مل جل کر
کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
باہر کی مٹی کے بدلے
گھر کا سونا بیچ دیا ہے
سب کا بوجھ اٹھانے والے
تو اس دنیا میں تنہا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے
تیرے پاؤں تلے سونا ہے
گہری نیند میں جاگو ناصر
وہ دیکھو سورج نکلا ہے

ناصر کاظمی



چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں
سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تیری یادیں

تو جیسے مرے پاس ہے اور محوِ سخن ہے
محفل سی جما دیتی ہیں اکثر تیری یادیں

میں کیوں نہ پھروں تپتی دوپہروں میں ہراساں
پھرتی ہیں تصوّر میں کھُلے سر تری یادیں

جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تیری یادیں

ناصر کاظمی



چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو

چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو
دل کی افسردگی کچھ کم تو ہوئی ہم نفسو شکر کرو

آؤ پھر یادِ عزیزاں ہی سے میخانۂ جاں گرم کریں
دیر کے بعد یہ محفل تو جمی ہم نفسو شکر کرو

آج پھر دیر کی سوئی ہوئی ندی میں نئی لہر آئی
دیر کے بعد کوئی ناؤ چلی ہم نفسو شکر کرو

رات بھر شہر میں بجلی سی چمکتی رہی ہم سوئے رہے
وہ تو کہیے کہ بلا سر سے ٹلی ہم نفسو شکر کرو

درد کی شاخِ تہی کاسہ میں اشکوں کے نئے پھول کھلے
دل جلی شام نے پھر مانگ بھری ہم نفسو شکر کرو

آسماں لالۂ خونیں کی نواؤں سے جگر چاک ہوا
قصرِ بیدار کی دیوار گری ہم نفسو شکر کرو

ناصر کاظمی



حاصلِ عشق ترا حُسنِ پشیماں ہی سہی

حاصلِ عشق ترا حُسنِ پشیماں ہی سہی
میری حسرت تری صورت سے نمایاں ہی سہی

حُسن بھی حُسن ہے محتاجِ نظر ہے جب تک
شعلۂ عشق چراغِ تہِ داماں ہی سہی

کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پھوٹ پڑے
ذوقِ آوارگیِ دشت و بیاباں ہی سہی

پردۂ گُل ہی سے شاید کوئی آواز آئے
فرصتِ سیر و تماشائے بہاراں ہی سہی

ناصر کاظمی



حسن کہتا ہے اک نظر دیکھو

حسن کہتا ہے اک نظر دیکھو
دیکھو اور آنکھ کھول کر دیکھو

سن کے طاؤس رنگ کی جھنکار
ابر اٹھا ہے جھوم کر دیکھو

پھول کو پھول کا نشاں جانو
چاند کو چاند سے ادھر دیکھو

جلوۂ رنگ بھی ہے اک آواز
شاخ سے پھول توڑ کر دیکھو

جی جلاتی ہے اوس غربت میں
پاؤں جلتے ہیں گھاس پر دیکھو

جھوٹی امید کا فریب نہ کھاؤ
رات کالی ہے کس قدر دیکھو

نیند آتی نہیں تو صبح تلک
گردِ مہتاب کا سفر دیکھو

اک کرن جھانک کر یہ کہتی ہے
سونے والو ذرا ادھر دیکھو

خمِ ہر لفظ ہے گلِ معنی
اہلِ تحریر کا ہنر دیکھو

ناصر کاظمی



ختم ہوا تاروں کا راگ

ختم ہوا تاروں کا راگ
جاگ مسافر اب تو جاگ

دھوپ کی جلتی تانوں سے
دشتِ فلک میں لگ گئی آگ

دن کا سنہرا نغمہ سن کر
ابلقِ شب نے موڑی باگ

کلیاں جھلسی جاتی ہیں
سورج پھینک رہا ہے آگ

یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ

ناصر کاظمی



خموشی انگلیاں چٹا رہی ہے

خموشی انگلیاں چٹا رہی ہے
تری آواز اب تک آ رہی ہے

دلِ وحشی لیے جاتا ہے لیکن
ہوا زنجیر سی پہنا رہی ہے

ترے شہرِ طرب کی رونقوں میں
طبیعت اور بھی گھبرا رہی ہے

کرم اے صرصرِ آلامِ دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے

کڑے کوسوں کے سنّاٹے میں لیکن
تری آواز اب تک آ رہی ہے

طنابِ خیمۂ گل تھام ناصر
کوئی آندھی اُفق سے آ رہی ہے

ناصر کاظمی



خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا

خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا
آنکھ کھلتے ہی چاند سا دیکھا

کیاریاں دھول سے اٹی پائیں
آشیانہ جلا ہوا دیکھا

فاختہ سر نگوں ببولوں میں
پھول کو پھول سے جدا دیکھا

اُس نے منزل پہ لا کے چھوڑ دیا
عمر بھر جس کا راستا دیکھا

ہم نے موتی سمجھ کے چوم لیا
سنگریزہ جہاں پڑا دیکھا

کم نما ہم بھی ہیں مگر پیارے
کوئی تجھ سا نہ خود نما دیکھا

ناصر کاظمی



خیالِ ترکِ تمنّا نہ کر سکے تو بھی

خیالِ ترکِ تمنّا نہ کر سکے تو بھی
اداسیوں کا مداوا نہ کر سکے تو بھی

کبھی وہ وقت بھی آئے کہ کوئی لمحۂ عیش
مرے بغیر گوارا نہ کر سکے تو بھی

خدا وہ دن بھی دکھائے تجھے کہ میری طرح
مری وفا پہ بھروسا نہ کر سکے تو بھی

میں اپنا عقدۂ دل تجھ کو سونپ دیتا ہوں
بڑا مزا ہو اگر وا نہ کر سکے تو بھی

تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہو گا
مجھے یہ ضد کہ مداوا نہ کر سکے تو بھی

نہ کر خیالِ تلافی کہ میرا زخمِ وفا
وہ زخم ہے جسے اچھا نہ کر سکے تو بھی

ناصر کاظمی



درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے

درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے
درد کی خامشی کا سخن پھول ہے

اڑتا پھرتا ہے پھلواریوں سے جدا
برگِ آوارہ جیسے پون پھول ہے

اس کی خوشبو دکھاتی ہے کیا کیا سمے
دشتِ غربت میں یادِ وطن پھول ہے

تختۂ ریگ پر کوئی دیکھے اسے
سانپ کے زہر میں رس ہے، پھن پھول ہے

میری لے سے مہکتے ہیں کوہ و دمن
میرے گیتوں کا دیوانہ پن پھول ہے

ناصر کاظمی



درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے

درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے
غم کی معیاد بڑھا جاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہجر میں آہ و بکا رسمِ کہن ہے لیکن
آج یہ رسم ہی دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

یوں توتم روشنئ قلب و نظر ہو لیکن
آج وہ معجزہ دکھلاؤ کہ کچھ رات کٹے

دل دکھاتا ہے وہ مل کر بھی مگر آج کی رات
اُسی بے درد کو لے آؤ کہ کچھ رات کٹے

دم گھٹا جاتا ہے ہے افسردہ دلی سے یارو
کوئی افواہ ہی پھیلاؤ کہ کچھ رات کٹے

میں بھی بیکار ہوں اور تم بھی ہو ویران بہت
دوستو آج نہ گھر جاؤ کہ کچھ رات کٹے

چھوڑ آئے ہو سرِشام اُسے کیوں ناصر
اُسے پھر گھر سے بلا لاؤ کہ کچھ رات کٹے

ناصر کاظمی



دفعتاً دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی

دفعتاً دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی
اس خرابے میں یہ دیوار کہاں سے آئی

آج کھلنے ہی کو تھا دردِ محبت کا بھرم
وہ تو کہیے کہ اچانک ہی تری یاد آئی

نشۂ تلخیٔ ایّام اترتا ہی نہیں
تیری نظروں نے گلابی تو بہت چھلکائی

یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدّر میں نہیں تنہائی

یوں تو ملنے کو وہ ہر روز ہی ملتا ہے مگر
دیکھ کر آج اُسے آنکھ بہت للچائی

ڈوبتے چاند پہ روئی ہیں ہزاروں آنکھیں
میں تو رویا بھی نہیں تم کو ہنسی کیوں آئی

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

ناصر کاظمی



دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا
آج تو میرا دل کہتا ہے
تو اس وقت اکیلا ہوگا
میرے چومے ہوئے ہاتھوں سے
اوروں کو خط لکھتا ہوگا
بھیگ چلیں اب رات کی پلکیں
تو اب تھک کے سویا ہوگا
ریل کی گہری سیٹی سن کر
رات کا جنگل گونجا ہوگا
شہر کے خالی اسٹیشن پر
کوئی مسافر اترا ہوگا
آنگن میں پھر چڑیاں بولیں
تو اب سو کر اٹھا ہوگا
یادوں کی جلتی شبنم سے
پھول سا مکھڑا دھویا ہوگا
موتی جیسی شکل بنا کر
آئینے کو تکتا ہوگا
شام ہوئی اب تو بھی شاید
اپنے گھر کو لوٹا ہوگا
نیلی دھندلی خاموشی میں
تاروں کی دھن سنتا ہوگا
میرا ساتھی شام کا تارا
تجھ سے آنکھ ملاتا ہوگا
شام کے چلتے ہاتھ نے تجھ کو
میرا سلام تو بھیجا ہوگا
پیاسی کرلاتی کونجوں نے
میرا دکھ تو سنایا ہوگا
میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا
ناصر تیرا میت پرانا
تجھ کو یاد تو آتا ہوگا

ناصر کاظمی

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا

آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست
تو مصیبت میں عجب یاد آیا

دن گزارا تھا بڑی مشکل سے
پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا

تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مر رہیں گے اگر اب یاد آیا

پھر کئی لوگ نظر سے گزرے
پھر کوئی شہرِ طرب یاد آیا

حالِ دل ہم بھی سُناتے لیکن
جب وہ رُخصت ہوا تب یاد آیا

بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

ناصر کاظمی



دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے

دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے
زندگی تو ہی بتا کیسے جیا چاہیے

میری نوائیں الگ، میری دعائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے

نرم ہے برگِ سمن، گرم ہے میرا سخن
میری غزل کے لیے ظرف نیا چاہیے

سر نہ کھپا اے جرس، مجھ کو مرا دل ہے بس
فرصتِ یک دو نفس مثلِ صبا چاہیے

باغ ترا باغباں، تو ہے عبث بدگماں
مجھ کو تو اے مہرباں ، تھوڑی سی جا چاہیے

خوب ہیں گل پھول بھی تیرے چمن میں مگر
صحنِ چمن میں کوئی نغمہ سرا چاہیے

ہے یہی عینِ وفا دل نہ کسی کا دکھا
اپنے بھلے کے لیے سب کا بھلا چاہیے

بیٹھے ہو کیوں ہار کے سائے میں دیوار کے
شاعرو، صورت گرو کچھ تو کیا چاہیے

مانو مری کاظمی تم ہو بھلے آدمی
پھر وہی آوارگی کچھ تو حیا چاہیے

ناصر کاظمی



دل میں آؤ عجیب گھر ہے یہ

دل میں آؤ عجیب گھر ہے یہ
عمرِ رفتہ کی رہگزر ہے یہ

سنگِ منزل سے کیوں نہ سر پھوڑیں
حاصلِ زحمتِ سفر ہے یہ

رنجِ غربت کے ناز اُٹھاتا ہوں
میں ہوں اب اور دردِ سر ہے یہ

ابھی رستوں کی دھوپ چھاؤں نہ دیکھ
ہمسفر دور کا سفر ہے یہ

دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں
ہم نہ سو جائیں اب تو ڈر ہے یہ

کچھ نئے لوگ آنے والے ہیں
گرم اب شہر میں خبر ہے یہ

اب کوئی کام بھی کریں ناصر
رونا دھونا تو عمر بھر ہے یہ

ناصر کاظمی



دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر کی رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ناصر کاظمی



دل میں اک ہوک سی اٹھی ہے ابھی

دل میں اک ہوک سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

کچھ تو نازم مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ سوچ بھی لگی ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈھتی ہے ابھی

ناصر کاظمی



دل میں اور تو کیا رکھا ہے

دل میں اور تو کیا رکھا ہے
تیرا درد چھپا رکھا ہے

اتنے دکھوں کی تیز ہوا میں
دل کا دیپ جلا رکھا ہے

دھوپ سے چہروں نے دنیا میں
کیا اندھیر مچا رکھا ہے

اس نگری کے کچھ لوگوں نے
دکھ کا نام دوا رکھا ہے

وعدۂ یار کی بات نہ چھیڑو
یہ دھوکا بھی کھا رکھا ہے

بھول بھی جاؤ بیتی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے

چپ چپ کیوں رہتے ہو ناصر
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے

ناصر کاظمی



دن پھر آئے ہیں باغ میں گُل کے

دن پھر آئے ہیں باغ میں گُل کے
بوئے گل ہے سُراغ میں گُل کے

دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گُل کے

کیسی آئی بہار اب کے برس
بوئے خوں ہے ایاغ میں گُل کے

اب تو روتوں میں خاک اڑتی ہے
سب کرشمے تھے باغ میں گُل کے

آنسوؤں کے دیئے جلا ناصر
دم نہیں اب چراغ میں گُل کے

ناصر کاظمی



دن ڈھلا رات پھر آ گئی، سو رہو سو رہو

دن ڈھلا رات پھر آ گئی، سو رہو سو رہو
منزلوں چھا گئی خامشی، سو رہو سو رہو

سارا دن تپتے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی سو رہو سو رہو

گرم سنسان قریوں کی دھرتی مہکنے لگی
خاک رشکِ اِرم بن گئی سو رہو سو رہو

رزم گاہِ جہاں بن گئی جائے امن و اماں
ہے یہی وقت کی راگنی سو رہو سو رہو

کیسے سنسان ہیں آسماں چپ کھڑے ہیں مکاں
ہے فضا جنبی اجنبی سو رہو سو رہو

تھک گئے ناقہ و سارباں، تھم گئے کارواں
گھنٹیوں کی صدا سو گئی سو رہو سو رہو

چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو

گردشِ وقت کی لوریاں رات کی رات ہیں
پھر کہاں یہ ہوا، یہ نمی سو رہو سو رہو

ساری بستی کے لوگ اس مدھرلے میں کھوئے گئے
دور بجنے لگی بانسری سو رہو سو رہو

دور شاخوں کے جھرمٹ میں جگنو بھی گم ہو گئے
چاند میں سو گئی چاندنی سو رہو سو رہو

گھر کے دیوار و در راہ تک تک کے شل ہو گئے
اب نہ آئے گا شاید کوئی سو رہو سو رہو

سُست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے مارو گھڑی دو گھڑی سو رہو سو رہو

منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل پڑے
دور ہے صبحِ روشن ابھی سو رہو سو رہو

ناصر کاظمی

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر
لگی ہے آگ کہیں رات سے کنارے پر

یہ کالے کوس کی پرہول رات ہے ساتھی
کہیں اماں نہ ملے گی تجھے کنارے پر

صدائیں آتی ہیں اُجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر

یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر

اس انقلاب کی شاید خبر نہ تھی اُن کو
جو ناؤ باندھ کے سوتے رہے کنارے پر

ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے لٹیروں کے
ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر

بچھڑ گئے تھے جو طوفاں کی رات میں ناصر
سنا ہے اُن میں سے کچھ آ ملے کنارے پر

ناصر کاظمی



دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا

دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا

میں اس جانب تو اس جانب
بیچ میں پتھر کا دریا تھا

ایک پیڑ کے ہات تھے خالی
اک ٹہنی پر دیا جلا تھا

مجھ پر آگ حرام تھی لیکن
آگ نے اپنا کام کیا تھا

ناصر کاظمی



دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے

کیا تماشا ہے کہ بے ایّامِ گل
پتّیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

آنچ کھا کھا کر صدائے رنگ کی
تتلیوں کے پر سنہرے ہو گئے

اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

ناصر کاظمی



دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے

کیا تماشا ہے کہ بے ایامِ گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

ہم بھلا چپ رہنے والے تھے کہیں
ہاں مگر حالات ایسے ہو گئے

اب تو خوش ہو جائیں اربابِ ہوس
جیسے وہ تھے ہم بھی ویسے ہو گئے

حسن اب ہنگامہ آرا ہو تو ہو
عشق کے دعوے تو جھوٹے ہو گئے

اے سکوتِ شامِ غم یہ کیا ہوا
کیا وہ سب بیمار اچھے ہو گئے

دل کو تیرے غم نے پھر آواز دی
کب کے بچھڑے پھر اکٹھے ہو گئے

آؤ ناصر ہم بھی اپنے گھر چلیں
بند اس گھر کے دریچے ہو گئے

ناصر کاظمی



دور اس تیرہ خاکداں سے دور

دور اس تیرہ خاکداں سے دور
دیکھ دنیائے جسم و جاں سے دور

آنے والی بہار کے افسوں
دیکھ ویرانۂ خزاں سے دور

پھول جلتے ہیں شاخچوں سے جدا
شمع روتی ہے شمع داں سے دور

شہر خلق خدا سے بیگانہ
کارواں میر کارواں سے دور

تیرے زندانیوں کی کون سنے
برق چمکی ہے آشیاں سے دور

چیختی ہیں ڈراؤنی راتیں
چاند نکلا ہے آسماں سے دور

سو گیا پچھلی رات کا جادو
کوئی اب لے چلے یہاں سے دور

دل عجب گوشۂ فراغت ہے
کیوں بھٹکتے ہو اس مکاں سے دور

کوئی سنتا نہیں یہاں ناصر
بات دل کی رہی زباں سے دور

ناصر کاظمی



دور فلک جب دہراتا ہے موسمِ گل کی راتوں کو

دور فلک جب دہراتا ہے موسمِ گل کی راتوں کو
کنجِ قفس میں سن لیتے ہیں بھولی بسری باتوں کو

ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا
سونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو

آتشِ غم کے سیلِ رواں میں نیندیں جل کر راکھ ہوئیں
پتھّر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو

مے خانے کا افسردہ ماحول تو یوں ہی تکتا ہے
خشک لبوں کی خیر مناؤ کچھ نہ کہو برساتوں کو

ناصر میرے منہ کی باتیں یوں تو سچّے موتی ہیں
لیکن ان کی باتیں سن کر بھُول گئے سب باتوں کو

ناصر کاظمی



دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

جدائیوں کے زخم دردِ زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آگئی مجھے بھی صبر آگیا

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انہیں کہ آسماں کھا گیا

یہ صبح کی سفیدیاں یہ دوپہر کی زردیاں
اب آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا

یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آگئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اُٹھو کہ آفتاب سر پہ آگیا

ناصر کاظمی



دیس سبز جھیلوں کا

دیس سبز جھیلوں کا
یہ سفر ہے میلوں کا
راہ میں جزیروں کی
سلسلہ ہے ٹیلوں کا
کشتیوں کی لاشوں پر
جمگھٹا ہے چیلوں کا
رنگ اڑتا جاتا ہے
شہر کی فصیلوں کا
دیکھ کر چلو ناصر
دشت ہے یہ فیلوں کا

ناصر کاظمی



دیکھ محبّت کا دستور

دیکھ محبّت کا دستور
تو مجھ سے میں تجھ سے دور
تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور
دوست بچھڑتے جاتے ہیں
شوق لیے جاتا ہے دور
ہم اپنا غم بھول گئے
آج کسے دیکھا مجبور
دل کی دھڑکن کہتی ہے
آج کوئی آئے گا ضرور
کوشش لازم ہے پیارے
آگے جو اس کو منظور
سورج ڈوب چلا ناصر
اور ابھی منزل ہے دور

ناصر کاظمی



رات ڈھل رہی ہے

رات ڈھل رہی ہے
ناؤ چل رہی ہے
برف کے نگر میں
آگ جل رہی ہے
لوگ سو رہے ہیں
رت بدل رہی ہے
آج تو یہ دھرتی
خوں اگل رہی ہے
خواہشوں کی ڈالی
ہاتھ مل رہی ہے
جاہلوں کی کھیتی
پھول پھل رہی ہے

ناصر کاظمی



رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں

رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں
کہ انتخابِ سخن ہے یہ انتخابوں میں

مری بھری ہوئی آنکھوں کو چشمِ کم سے نہ دیکھ
کہ آسمان مقیّد ہیں ان حبابوں میں

ہر آن دل سے الجھتے ہیں دو جہان کے غم
گھرا ہے ایک کبوتر کئی عقابوں میں

ذرا سنو تو سہی کان دھر کے نالۂ دل
یہ داستاں نہ ملے گی تمہیں کتابوں میں

نئی بہار دکھاتے ہیں داغِ دل ہر روز
یہی تو وصف ہے اس باغ کے گلابوں میں

پون چلی تو گل و برگ دف بجانے لگے
اداس خوشبوئیں لو دے اٹھیں نقابوں میں

ہوا چلی تو کھلے بادبانِ طبع رسا
سفینے چلنے لگے یاد کے سرابوں میں

کچھ اس ادا سے اُڑا جا رہا ہے ابلقِ رنگ
صبا کے پاؤں ٹھہرتے نہیں رکابوں میں

بدلتا وقت یہ کہتا ہے ہر گھڑی ناصر
کہ یادگار ہے یہ وقت انقلابوں میں

ناصر کاظمی



رنگ برسات نے بھرے کچھ تو

رنگ برسات نے بھرے کچھ تو
زخم دل کے ہرے کچھ تو

فرصتِ بے خودی غنیمت ہے
گردشیں ہو گئیں پرے کچھ تو

کتنے شوریدہ سر تھے پروانے
شام ہوتے ہی جل مرے کچھ تو

ایسا مشکل نہیں ترا ملنا
دل مگر جستجو کرے کچھ تو

آؤ ناصر کوئی غزل چھیڑیں
جی بہل جائے گا اے کچھ تو

ناصر کاظمی



رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے، سونا ہوّ رخسار بھی

درد کے جھونکوں نے اب کی دل ہی ٹھنڈا کر دیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خوں بار بھی

بیٹھے بیٹھے جانے کیوں بیتاب ہو جاتا ہے دل
پوچھتے کیا ہو میاں، اچھّا بھی ہوں بیمار بھی

شوقِ آزادی لئے جاتا ہے منزل سے پرے
روکتی ہے ہر قدم آوازِ پائے یار بھی

سادگی سے تم نہ سمجھے ترکِ دنیا کا سبب
ورنہ وہ درویش تھے پردے میں دنیا دار بھی

کس طرح گزرے گا ناصر فرصتِ ہستی کا دن
جم گیا دیوار بن کر سایۂ دیوار بھی

ناصر کاظمی



رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے

رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے
جیسے سپنا کوئی اداس اداس

کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتّیاں محوِ یاس، گھاس اداس

خیر ہو شہر شبنم و گل کی
کوئی پھرتا ہے آس پاس اداس

بیٹھے بیٹھے برس پڑیں آنکھیں
کر گئی پھر کسی کی آس اداس

کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے
لیے پھرتی ہے کوئی باس اداس

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھرو اداس اداس

صبح ہونے کو ہے اٹھو ناصر
گھر میں بیٹھے ہو کیوں نراس اداس

ناصر کاظمی



رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر

رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر

بے نشاں ہے سفر رات ساری پڑی ہے مگر
آرہی ہے صدا دم بدم صبر کر صبر کر

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم صبر کر صبر کر

تیرے قدموں سے جاگیں گے اُجڑے دلوں کے ختن
پا شکستہ غزالِ حرم صبر کر صبر کر

شہر اجڑے تو کیا ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

یہ محلاّتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کر صبر

دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر

لہلہا ئیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں
کھل کے برسے گا ابر کرم صبر کر صبر کر

کیوں پٹکتا ہے سر سنگ سے جی جلا ڈھنگ سے
دل ہی بن جائے گا خود صنم صبر کر صبر کر

پہلے کھل جائے دل کا کنول پھر لکھیں گے غزل
کوئی دم اے صریر قلم صبر کر صبر کر

درد کے تار ملنے تو دے ہونٹ ہلنے تو دے
ساری باتیں کریں گے رقم صبر کر صبر کر

دیکھ ناصر زمانے میں کوئی کسی کا نہیں
بھول جا اُس کے قول و قسم صبر کر صبر کر

ناصر کاظمی

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

اب کی فصلِ بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

ناصر کاظمی



زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا

زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرز سخن کو ترسے گا

نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شرابِ کہن کو ترسے گا

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا

انہی کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبتِ اربابِ فن کو ترسے گا

بدل سکو تو بدل دو یہ باغباں ورنہ
یہ باغ سایۂ سرو سمن کو ترسے گا

ہوئے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو، سورج کرن کو ترسے گا

ناصر کاظمی



زندگی بھر وفا ہمیں سے ہوئی

زندگی بھر وفا ہمیں سے ہوئی
سچ ہے یارو خطا ہمیں سے ہوئی
دل نے ہر داغ کو رکھا محفوظ
یہ زمیں خوشنما ہمیں سے ہوئی
ہم سے پہلے زمینِ شہرِ وفا
خاک تھی کیمیا ہمیں سے ہوئی
کتنی مردم شناس ہے دنیا
منحرف بے حیا ہمیں سے ہوئی
کون اٹھاتا شبِ فراق کے ناز
یہ بلا آشنا ہمیں سے ہوئی
بے غرض کون گنواتا ہے
تیری قیمت ادا ہمیں سے ہوئی
ستمِ ناروا تجھی سے ہوا
تیرے حق میں دعا ہمیں سی ہوئی
سعیٔ تجدید دوستی ناصر
آج کیا بارہا ہمیں سے ہوئی

رنگ منّت کشِ آواز نہیں
گُل بھی ہے ایک نوا غور سے سُن
خامشی حاصلِ موسیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سُن
آئنہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سُن
عشق کو حُسن سے خالی نہ سمجھ
نالۂ اہلِ وفا غور سے سُن
دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سُن
ہر قدم راہِ طلب میں ناصر
جرسِ دل کی صدا غور سے سُن

ناصر کاظمی

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن
دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سُن
چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہِلا غور سے سُن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سُن
ہر نفس دامِ گرفتاری ہے
تو گرفتارِ بلا غور سے سُن
دل تڑپتا ہے کیوں آخرِ شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سُن
اسی منزل میں ہیں سب ہجر و وصال
رہروِ آبلہ پا غور سے سُن
اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سُن
!کعبہ سنسان ہے کیوں اے واعظ
ہاتھ کانوں سے اُٹھا غور سے سُن
موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ مری بزم میں آ غور سے سُن
کیا گزرتی ہے کسی کے دل پر
تو بھی اے جانِ وفا غور سے سُن
کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شب گزیدوں کی دعا غور سے سُن
ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول
صبح کی لَے کو ذرا غور سے سُن
کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سُن
برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سُن

ناصر کاظمی

سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے

سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے

پہلے اک روزنِ در توڑا تھا
اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے

پھر سرِ صبح وہ قصہ چھیڑا
دن کی قندیل بجھا دی ہم نے

آتشِ غم کے شرارے چن کر
آگ زنداں میں لگا دی ہم نے

رہ گئے دستِ صبا کملا کر
پھول کو آگ پلا دی ہم نے

آتشِ گل ہو کہ ہو شعلۂ ساز
جلنے والوں کو ہوا دی ہم نے

کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینۂ نے میں چھپا دی ہم نے

دمِ مہتاب فشاں سے ناصر
آج تو رات جگا دی ہم نے

ناصر کاظمی



سر میں جب عشق کا سودا نہ رہا

سر میں جب عشق کا سودا نہ رہا
کیا کہیں زیست میں کیا کیا نہ رہا

اب تو دنیا بھی وہ دنیا نہ رہی
اب ترا دھیان بھی اُتنا نہ رہا

قصّۂ شوق سناؤں کس کو
راز داری کا زمانا نہ رہا

زندگی جس کی تمنّا میں کٹی
وہ مرے حال سے بیگانہ رہا

ڈیرے ڈالے ہیں خزاں نے چوندیس
گُل تو گُل، باغ میں کانٹا نہ رہا

دن دہاڑے یہ لہو کی ہولی
خلق کو خوف خدا کا نہ رہا

اب تو سو جاؤ ستم کے مارو
آسماں پر کوئی تارا نہ رہا

ناصر کاظمی



سفر منزلِ شب یاد نہیں

سفر منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قُرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا اُلجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

ناصر کاظمی



سناتا ہے کوئی بھولی کہانی

سناتا ہے کوئی بھولی کہانی
مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی

یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے
سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی

یہاں اک شہر تھا شہرِ نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی

میں وہ دل ہوں دبستانِ الم کا
جسے روئے گی صدیوں شادمانی

تصور نے اُسے دیکھا ہے اکثر
خرد کہتی ہے جس کو لا مکانی

خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بسا لیتا ہوں اک دنیا سہانی

ہجومِ نشّۂ فکرِ سخن میں
بدل جاتے ہیں لفظوں کے معانی

بتا اے ظلمتِ صحرائے امکاں
کہاں ہوگا مرے خوابوں کا ثانی

اندھیری شام کے پردوں میں چھپ کر
کسے روتی ہے چشموں کی روانی

کرن پریاں اترتی ہیں کہاں سے
کہاں جاتے ہیں رستے کہکشانی

پہاڑوں سے چلی پھر کوئی آندھی
اُڑے جائے ہیں اوراقِ خزانی

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

ناصر کاظمی

سو گئی شہر کی ہر ایک گلی

سو گئی شہر کی ہر ایک گلی
اب تو آجا کہ رات بھیگ چلی

کوئی جھونکا چلا تو دل دھڑکا
دل دھڑکتے ہی تیری یاد آئی

کون ہے تو کہاں سے آیا ہے
کہیں دیکھا ہے تجھ کو پہلے بھی

تو بتا کیا تجھے ثواب ملا
خیر میں نے تو رات کاٹ ہی لی

مجھ سے کیا پوچھتا ہے میرا حال
سامنے ہے ترے کتاب کھلی

میرے دل سے نہ جا خدا کے لیے
ایسی بستی نہ پھر بسے کبھی

میں اسی غم میں گھلتا جاتا ہوں
کیا مجھے چھوڑ جائے گا تو بھی

ایسی جلدی بھی کیا ، چلے جانا
مجھے اک بات پوچھنی ہے ابھی

آ بھی جا میرے دل کے صدر نشیں
کب سے خالی پڑی ہے یہ کرسی

میں تو ہلکان ہو گیا ناصر
مدتِ ہجر کتنی پھیل گئی

ناصر کاظمی



شبنم آلود پلک یاد آئی

شبنم آلود پلک یاد آئی
گلِ عارض کی جھلک یاد آئی

پھر سلگنے لگے یادوں کے کھنڈر
پھر کوئی تاکِ صنک یاد آئی

کبھی زلفوں کی گھٹا نے گھیرا
کبھی آنکھوں کی چمک یاد آئی

پھر کسی دھیان نے ڈیرے ڈالے
کوئی آوارہ مہک یاد آئی

پھر کوئی نغمہ گلو گیر ہوا
کوئی بے نام کسک یاد آئی

ذرّے پھر مائلِ رم ہیں ناصر
پھر اُنھیں سیرِ فلک یاد آئی

ناصر کاظمی



شعاعِ حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی

شعاعِ حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی
وہ روشنی تھی کہ صورت نظر نہ آتی تھی

کسے ملیں کہاں جائیں کہ رات کالی ہے
وہ شکل ہی نہ رہی جو دیے جلاتی تھی

وہ تو دن تھے حقیقت میں عمر کا حاصل
خوشا وہ دن کہ ہمیں روز موت آتی تھی

ذرا سی بات سہی تیرا یاد آجانا
ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی تھی

اداس بیٹھے ہو کیوں ہاتھ توڑ کر ناصر
وہ نَے کہاں ہے جو تاروں کی نیند اڑاتی تھی

ناصر کاظمی



شعلہ سا پیچ وتاب میں دیکھا

شعلہ سا پیچ وتاب میں دیکھا
جانے کیا اضطراب میں دیکھا

گل کدوں کے طلسم بھول گئے
وہ تماشا نقاب میں دیکھا

آج ہم نے تمام حسنِ بہار
ایک برگِ گلاب میں دیکھا

سر کھلے، پابرہنہ، کھوٹے پر
رات اُسے ماہتاب میں دیکھا

فرصتِ موسمِ نشاط نہ پوچھ
جیسے اک خواب، خواب میں دیکھا

ناصر کاظمی



شکوہ بہ طرزِ عام نہیں آپ سے مجھے

شکوہ بہ طرزِ عام نہیں آپ سے مجھے
ناکام ہوں کہ کام نہیں آپ سے مجھے

کہتا، سلوک آپ کے ایک ایک سے مگر
مطلوب انتقام نہیں آپ سے مجھے

اے منصفو حقائق و حالات سے الگ
کچھ بحث خاص و عام نہیں آپ سے مجھے

یہ شہر دل ہے شوق سے رہیئے یہاں مگر
امیدِ انتظام نہیں آپ سے مجھے

فرصت ہے اور شام بھی گہری ہے کس قدر
اس وقت کچھ کلام نہیں آپ سے مجھے

ناصر کاظمی



شہر در شہر گھر جلائے گئے

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیئے بجھائے گے
آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمعِ عام میں لُٹائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے

ناصر کاظمی



شہر سنسان ہے کدھر جائیں

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں

یوں ترے دھیان سے لرزتا ہوں
جیسے پتے ہوا سے ڈر جائیں

اُن اجالوں کی دھن میں پھرتا ہوں
چھب دکھاتے ہی جو گزر جائیں

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

ناصر کاظمی



شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے

شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے
دل تجھے بھی بھلائے جاتا ہے

اگلے وقتوں کی یادگاروں کو
آسماں کیوں مٹائے جاتا ہے

سوکھتے جارہے ہیں گل بوٹے
باغ کانٹے اگائے جاتا ہے

جاتے موسم کو کس طرح روکوں
پتّہ پتّہ اڑائے جاتا ہے

حال کس سے کہوں کہ ہر کوئی
اپنی اپنی سنائے جاتا ہے

کیا خبر کون سی خوشی کے لیے
دل یونہی دن گنوائے جاتا ہے

رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصر
تجھے کیا رنج کھائے جاتا ہے

ناصر کاظمی



صبح کا تارا ابھر کر رہ گیا

صبح کا تارا ابھر کر رہ گیا
رات کا جادو بکھر کر رہ گیا

ہم سفر سب منزلوں سے جا ملے
میں نئی راہوں میں مر کر رہ گیا

کیا کہوں اب تجھ سے اے جوئے کم آب
میں بھی دریا تھا اتر کر رہ گیا

ناصر کاظمی



صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہِ شوق کس منزل سے گزری

کبھی روئے کبھی تجھ کو پکارا
شبِ فرقت بڑی مشکل سے گزری

ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں
تری آواز جیسے دل سے گزری

مرا دل خوگرِ طوفاں ہے ورنہ
یہ کشتی بارہا ساحل سے گزری

ناصر کاظمی



عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا
حسن خود محوِ تماشا ہوگا

سُن کے آوازۂ زنجیرِ صبا
قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

جرسِ شوق اگر ساتھ رہی
ہر نفس شہپرِ عنقا ہوگا

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

کون دیکھے گا طلوعِ خورشید
ذرّہ جب دیدۂ بینا ہوگا

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہوگا

پھر سلگنے لگا صحرائے حیات
ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا

پھر کسی دھیان کے صد راہے پر
دلِ حیرت زدہ تنہا ہوگا

پھر کسی صبحِ طرب کا جادو
پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گل زمینوں کے خنک رمنوں میں
جشنِ رامش گری برپا ہوگا

پھر نئی رُت کا اشارہ پا کر
وہ سمن بو چمن آرا ہوگا

گُلِ شب تاب کی خوشبو لے کر
ابلقِ صبح روانہ ہوگا

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید
نکہتِ گُل کا بسیرا ہوگا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

دیکھ کر آئینۂ آبِ رواں
پتّہ پتّہ لبِ گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

ناصر کاظمی



عشق میں جیت ہوئی یا مات

عشق میں جیت ہوئی یا مات
آج کی رات نہ چھیڑ یہ بات

یوں آیا وہ جانِ بہار
جیسے جگ میں پھیلے بات

رنگ کھُلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات

کچھ نہ کہا اور کچھ نہ سُنا
دل میں رہ گئی دل کی بات

یار کی نگری کوسوں دور
کیسے کٹے گی بھاری رات

بستی والوں سے چھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلی رات

سنّاٹوں میں سنتے ہیں
سُنی سُنائی کوئی بات

پھر جاڑے کی رُت آئی
چھوٹا دن اور لمبی رات

ناصر کاظمی



غم ہے یا خوشی ہے تو

غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو
آفتوں کے دور میں
چین کی گھڑی ہے تو
میری رات کا چراغ
میری نیند بھی ہے تو
میں خزاں کی شام ہوں
رُت بہار کی ہے تو
دوستوں کے درمیاں
وجہِ دوستی ہے تو
میری ساری عمر میں
ایک ہی کمی ہے تو
میں تو وہ نہیں رہا
ہاں مگر وہی ہے تو
ناصر اس دیار میں
کتنا اجنبی ہے تو

ناصِر کاظمی



فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے

فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے
خوفِ بے مہریِ خزاں بھی ہے
خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں
آمدِ صبح کا سماں بھی ہے
رنگ بھی اڑ رہا ہے پھولوں کا
غنچہ غنچہ شرر فشاں بھی ہے
اوس بھی ہے کہیں کہیں لرزاں
بزمِ انجم دھواں دھواں بی ہے
کچھ تو موسم بھی ہے خیال انگیز
کچھ طبیعت مری رواں بھی ہے
کچھ ترا حسن بھی ہے ہوش ربا
کچھ مری شوخئ بیاں بھی ہے
ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا
ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے
وجہِ تسکین بھی ہے اس کا خیال
حد سے بڑھ جائے تو گراں بھی ہے
زندگی جس کے دم سے ہے ناصر
یاد اس کی عذابِ جاں بھی ہے

ناصر کاظمی



قصے ہیں خموشی میں نہاں اور طرح کے

قصے ہیں خموشی میں نہاں اور طرح کے
ہوتے ہیں غمِ دل کے بیاں اور طرح کے

تھی اور ہی کچھ بات کہ تھا غم بھی گوارا
حالات ہیں اب درپئے جاں اور طرح کے

اے راہروِ راہِ وفا دیکھ کے چلنا
اس راہ میں ہیں سنگِ گراں اور طرح کے

کھٹکا ہے جدائی کا نہ ملنے کی تمنا
دل کو ہیں مرے وہم و گماں اور طرح کے

ہر سال تو کلیاں ہی جھڑی تھیں مگر اب کے
گلشن میں ہیں آثارِ خزاں اور طرح کے

دنیا کو نہیں تاب مرے درد کی یارب
دے مجھ کو اسالیبِ فغاں اور طرح کے

ہستی کا بھرم کھول دیا ایک نظر نے
اب اپنی نظر میں ہیں جہاں اور طرح کے

لشکر ہے نہ پرچم ہے نہ دولت ہے نہ ثروت
ہیں خاک نشینوں کے نشاں اور طرح کے

مرتا نہیں اب کوئی کسی کے لیے ناصر
تھے اپنے زمانے کے جواں اور طرح کے

ناصر کاظمی



قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں

قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں
ہر اک سانس کو ہم صبا جانتے ہیں

لہو رو کے سینچا ہے ہم نے چمن کو
ہر اک پھول کا ماجرا جانتے ہیں

جسے نغمۂ نے سمجھتی ہے دنیا
اُسے بھی ہم اپنی صدا جانتے ہیں

اشارا کرے جو نئی زندگی کا
ہم اُس خود کُشی کو روا جانتے ہیں

تری دھُن میں کوسوں سفر کرنے والے
تجھے سنگِ منزل نما جانتے ہیں

ناصر کاظمی



قہر سے دیکھ نہ ہر آن مجھے

قہر سے دیکھ نہ ہر آن مجھے
آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے

یک بیک آ کے دکھا دو جھمکی
کیوں پھراتے ہو پریشان مجھے

ایک سے ایک نئی منزل میں
لیے پھرتا ہے ترا دھیان مجھے

سُن کے آوازۂ گل کچھ نہ سنا
بس اسی دن سے ہوئے کان مجھے

جی ٹھکانے نہیں جب سے ناصر
شہر لگتا ہے بیابان مجھے

ناصر کاظمی



کب تک بیٹھے ہاتھ ملیں

کب تک بیٹھے ہاتھ ملیں
چل ساتھی کہیں اور چلیں
اب کس گھاٹ پہ باندھیں ناؤ
اب یہ طوفاں کیسے ٹلیں
اب یہ مانگیں کون بھرے
اب یہ پودے کیسے پھلیں
جگ جگ جئیں مرے ساتھی
جلنے والے اور جلیں
تجھ کو چین ملے ناصر
تیرے دکھ گیتوں میں ڈھلیں

ناصر کاظمی



کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا

کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا
کہ تجھ سے مل کے بھی ترا خیال آ کے رہ گیا

جدائیوں کے مرحلے بھی حُسن سے تہی نہ تھے
کبھی کبھی تو شوق آئنے دکھا کے رہ گیا

کسے خبر کہ عشق پر قیامتیں گزر گئیں
زمانہ اس نگاہ کا فریب کھا کے رہ گیا

یہ کیا مقامِ شوق ہے، نہ آس ہے کہ یاس ہے
یہ کیا ہوا کہ لب پہ تیرا نام آ کے رہ گیا

کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریکِ منزلِ جنوں
بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا

چراغِ شامِ آرزو بھی جھلملا کے رہ گئے
ترا خیال راستے سُجھا سُجھا کے رہ گیا

چمک چمک کے رہ گئیں نجوم و گل کی منزلیں
میں درد کی کہانیاں سُنا سُنا کے رہ گیا

ترے وصال کی امید اشک بن کے بہہ گئی
خوشی کا چاند شام ہی سے جھلملا کے رہ گیا

وہی اداس روز و شب، وہی فسوں، وہی ہوا
ترے وصال کا زمانہ یاد آ کے رہ گیا

ناصر کاظمی



کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے
اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں
نشّۂ خوابِ گراں تھا پہلے
اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے
سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے
یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے
یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے
اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے
ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اُس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
اب وہ دریا، نہ وہ بستی، نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
اُڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو اک شوخ جواں تھا پہلے
کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں
درد مجبورِ فغاں تھا پہلے
ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھّر میں نہاں تھا پہلے
ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے
غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

ناصر کاظمی

کچھ یادگارِ شہر ستمگر ہی لے چلیں

کچھ یادگارِ شہر ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

ناصر کاظمی



کرتا اسے بے قرار کچھ دیر

کرتا اسے بے قرار کچھ دیر
ہوتا اگر اختیار کچھ دیر

کیا روئیں فریبِ آسماں کو
اپنا نہیں اعتبار کچھ دیر

آنکھوں میں کٹی پہاڑ سی رات
سو جا دلِ بے قرار کچھ دیر

اے شہرِ طرب کو جانے والو
کرنا مرا انتظار کچھ دیر

بے کیفیِ روز و شب مسلسل
سرمستیِ انتظار کچھ دیر

تکلیفِ غمِ فراق دائم
تقریبِ وصالِ یار کچھ دیر

یہ غنچہ و گل ہیں سب مسافر
ہے قافلۂ بہار کچھ دیر

دنیا تو سدا رہے گی ناصر
ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر

ناصر کاظمی



کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے

کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے

اہلِ غم ہیں کہ صبح کی تصویر
دل بجھا سا ہے آنکھ ترسی ہے

کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ
اُس کی صورت بھی اپنے گھر کی سی ہے

بے ثمر ہی سہی ہے شاخِ مراد
برف پگھلی تو آگ برسی ہے

ال میں اب کیا رہا ہے تیرے بعد
ایک سنسان رہ گزر سی ہے

صبح تک ہم نہ سو سکے ناصر
رات بھر کتنی اوس برسی ہے

ناصر کاظمی



کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدّر کی سخت راہوں میں
اُڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے

ناصر کاظمی



کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے

کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے
وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے

مری بربادیوں پر رونے والے
تجھے محوِ فغاں دیکھا نہ جائے

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غمِ صد کارواں دیکھا نہ جائے

کہیں آگ اور کہیں شعلوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

در و دیوار ویراں شمع مدھم
شبِ غم کا سماں دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

بھری برسات خالی جا رہی ہے
سرِ ابرِ رواں دیکھا نہ جائے

کہیں تم، اور کہیں ہم، کیا غضب ہے
فراقِ جسم و جاں دیکھا نہ جائے

وہی جو حاصلِ ہستی ہے ناصر
اُسی کو مہرباں دیکھا نہ جائے

ناصر کاظمی



کل جنہیں زندگی تھی راس بہت

کل جنہیں زندگی تھی راس بہت
آج دیکھا انہیں اداس بہت

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت

کیوں نہ روؤں تری جدائی میں
دن گزرتے ہیں تیرے پاس بہت

چھاؤں مل جائے دامنِ گل کی
ہے غریبی میں یہ لباس بہت

وادیِ دل میں پاؤں دیکھ کے رکھ
ہے یہاں درد کی اُگاس بہت

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصر
یاد آتی ہے گل کی باس بہت

ناصر کاظمی



کم فرصتیِ خوابِ طرب یاد رہے گی

کم فرصتیِ خوابِ طرب یاد رہے گی
گزری جو ترے ساتھ، وہ شب یاد رہے گی

ہر چند ترا عہدِ وفا بھول گئے ہم
وہ کشمکشِ صبر طلب یاد رہے گی

سینے میں امنگوں کا وہی شور ہے اب تک
وہ شوخیِ یک جنبشِ لب یاد رہے گی

پھر جس کے تصور میں برسنے لگیں آنکھیں
وہ برہمیِ صحبتِ شب یاد رہے گی

گو ہجر کے لمحات بہت سخت تھے لیکن
ہر بات بعنوانِ طرب یاد رہے گی

ناصر کاظمی



کُنج کُنج نغمہ زن بسنت آگئی

کُنج کُنج نغمہ زن بسنت آگئی
یاب سجے گی انجمن بسنت آگئی

اُڑ رہے ہیں شہر میں پتنگ رنگ رنگ
جگمگا اٹھا گگن بسنت آگئی

موہنے لبھانے والے پیارے پیارے لوگ
دیکھنا چمن چمن بسنت آگئی

سبز کھیتیوں پہ پھر نکھار آگیا
لے کے زرد پیرہن بسنت آگئی

پچھلے سال کے ملال دل سے مٹ گئے
لے کے پھر نئی چبھن بسنت آگئی

ناصر کاظمی



کہاں گئے وہ سخنور جو میر محفل تھے

کہاں گئے وہ سخنور جو میر محفل تھے
ہمارا کیا ہے بھلا ہم کہاں کے کامل تھے

بھلا ہوا کہ ہمیں یوں بھی کوئی کام نہ تھا
جو ہاتھ ٹوٹ گئے ٹوٹنے کے قابل تھے

حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے

گزر گئے ہیں جو خوشبوئے رائگاں کی طرح
وہ چند روز مری زندگی کا حاصل تھے

پڑے ہیں سایۂ گل میں جو سرخرو ہو کر
وہ جاں نثار ہی اے شمع تیرے قاتل تھے

اب اُن سے دور کا بھی واسطہ نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو مرے رتجگوں میں شامل تھے

ناصر کاظمی



کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در

کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در

یہ وہی دیار ہے دوستو جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر نگر نگر

کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

جنہیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بچھا دیا

جو گراں تھے سینۂ چاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

مری بیکسی کا نہ غم کرو مگر اپنا فائدہ سوچ لو

تمہیں جس کی چھاؤں عزیز ہے میں اُسی درخت کا ہوں ثمر

یہ بجا ہے آج اندھیرا ہے ذرا رت بدلنے کی دیر ہے

جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

ناصر کاظمی



کوئی جیے یا کوئی مرے

کوئی جیے یا کوئی مرے
تم اپنی سی کر گزرے

دل میں تیری یادوں نے
کیسے کیسے رنگ بھرے

اب وہ امنگیں ہیں نہ وہ دل
کون اب تجھ کو یاد کرے

پیار کی ریت نرالی ہے
کوئی کرے اور کوئی بھرے

پھول تو کیا کانٹے بھی نہیں
کیسے اُجڑے باغ ہرے

بادل گرجا پون چلی
پھلواری میں پھول ڈرے

پت جھڑ آنے والی ہے
رس پی کر اُڑ جا بھنورے

ناصر کاظمی



کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے

کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے
بڑی دیر میں تجھے دیکھ کر یہ لگا کہ تو کوئی اور ہے

یہ گناہگاروں کی سرزمیں ہے بہشت سے بھی سوا حسیں
مگر اس دیار کی خاک میں سببِ نمو کوئی اور ہے

جسے ڈھونڈتا ہوں گلی گلی وہ ہے میرے جیسا ہی آدمی
مگر آدمی کے لباس میں وہ فرشتہ خو کوئی اور ہے

کوئی اور شے ہے وہ بے خبر جو شراب سے بھی ہے تیز تر
مرا میکدہ کہیں اور ہے مرا ہم سبو کوئی اور ہے

ناصر کاظمی



کون اس راہ سے گزرتا ہے

کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل یوں ہی انتظار کرتا ہے

دیکھ کر بھی نہ دیکھنے والے
دل تجھے دیکھ دیکھ ڈرتا ہے

شہرِ گُل میں کٹی ہے ساری رات
دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر کاظمی



کیا دن مجھے عشق نے دکھائے

کیا دن مجھے عشق نے دکھائے
اِک بار جو آئے پھر نہ آئے

اُس پیکرِ ناز کا فسانہ
دل ہوش میں آئے تو سُنائے

وہ روحِ خیال و جانِ مضموں
دل اس کو کہاں سے ڈھونڈھ لائے

آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھرتھرائے

مہکی ہوئی سانس نرم گفتار
ہر ایک روش پہ گل کھلائے

راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں
آنچل میں حیا سے منہ چھپائے

اُڑتی ہوئی زلف یوں پریشاں
جیسے کوئی راہ بھول جائے

کچھ پھول برس پڑے زمیں پر
کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

ناصر کاظمی



کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سوجاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

کردیا آج زمانے نے انہیں بھی مجبور
کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اُس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

اتفاقاتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصر
آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سنا کرتے تھے

ناصر کاظمی



کیا لگے آنکھ پھر دل میں سمایا کوئی

کیا لگے آنکھ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایا کوئی

فکر یہ تھی کہ شبِ ہجر کٹے گی کیوں کر
لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی

شوق یہ تھا کہ محبت میں جلیں گے چپ چاپ
رنج یہ ہے کہ تماشا نہ دکھایا کوئی

شہر میں ہمدمِ دیرینہ بہت تھے ناصر
وقت پڑنے پہ مرے کام نہ آیا کوئی

ناصر کاظمی



کیوں غمِ رفتگاں کرے کوئی

کیوں غمِ رفتگاں کرے کوئی
فکرِ واماندگاں کرے کوئی

تیرے آوارگانِ غربت کو
شاملِ کارواں کرے کوئی

زندگی کے عذاب کیا کم ہیں
کیوں غمِ لامکاں کرے کوئی

دل ٹپکنے لگا ہے آنکھوں سے
اب کسے رازداں کرے کوئی

اس چمن میں برنگِ نکہتِ گُل
عمر کیوں رائگاں کرے کوئی

شہر میں شور گھر میں تنہائی
دل کی باتیں کہاں کرے کوئی

یہ خرابے ضرور چمکیں گے
اعتبارِ خزاں کرے کوئی

ناصر کاظمی



گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اُسے ڈھونڈتی ہے ہردم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یونہی ذرا کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا دورِ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی ستمگروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اٹھا تھا رات دِل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

ناصر کاظمی

گا رہا تھا کوئی درختوں میں

گا رہا تھا کوئی درختوں میں
رات نیند آ گئی درختوں میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے
آگ سی لگ گئی درختوں میں

مینہہ برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں

یہ ہوا تھی کہ دھیان کا جھونکا
کس نے آواز دی درختوں میں

ہم ادھر گھر میں ہو گئے بے چین
دور آندھی چلی درختوں میں

لیے جاتے ہے موسموں کی پکار
اجنبی اجنبی درختوں میں

کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دور
جا کے دیکھو کبھی درختوں میں

نیلے پیلے سفید لال ہرے
رنگ دیکھے سبھی درختوں میں

خوشبوؤں کی اداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں

دیر تک اُس کی تیز آنکھوں میں
روشنی سی رہی درختوں میں

چلتے چلتے ڈگر اجالوں کی
جانے کیوں مڑ گئی درختوں میں

سہمے سہمے تھے رات اہل چمن
تھا کوئی آدمی درختوں میں

ناصر کاظمی



گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے

ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہلِ دنیا نے

بقدرِ تشنہ لبی پرسشِ وفا نہ ہوئی
چھلک کے رہ گئے تیری نظر کے پیمانے

خیال آگیا مایوس رہ گزاروں کا
پلٹ کے آ گئے منزل سے تیرے دیوانے

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے

امیدِ پرسشِ غم کس سے کیجیے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

ناصر کاظمی



گل نہیں مے نہیں پیالہ نہیں

گل نہیں مے نہیں پیالہ نہیں
کوئی بھی یادگارِ رفتہ نہیں

فرصتِ شوق بن گئی دیوار
اب کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں

ہوش کی تلخیاں مٹیں کیسے
جتنی پیتا ہوں اتنا نشّہ نہیں

دل کی گہرائیوں میں ڈوب کے دیکھ
کوئی نغمہ خوشی کا نغمہ نہیں

غم بہر رنگ دل کشا ہے مگر
سننے والوں کو تابِ نالہ نہیں

مجھ سے کہتی ہے موجِ صبح نشاط
پھول خیمہ ہے پیش خیمہ نہیں

ابھی وہ رنگ دِل میں پیچاں ہیں
جنہیں آواز سے علاقہ نہیں

ابھی وہ دشت منتظر ہیں مرے
جن پہ تحریر پائے ناقہ نہیں

یہ اندھیرے سلگ بھی سکتے ہیں
تیرے دل میں مگر وہ شعلہ نہیں

راکھ کا ڈھیر ہے وہ دل ناصر
جس کی دھڑکن صدائے تیشہ نہیں

ناصر کاظمی



گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ

گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
بستی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فنکار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ

جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ

ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

ناصر کاظمی



گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل

ایک سمے ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل

یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل

میں تو ایک نئی دنیا کی دھن میں بھٹکتا پھرتا ہوں
میری تجھ سے کیسے نبھے گی ایک ہیں تیرے فکر و عمل

میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے، دیکھ اس کالی رات کو دیکھ
میں وہی تیرا ہمراہی ہوں ساتھ مرے چلنا ہو تو چل

ناصر کاظمی



لبِ معجز بیاں نے چھین لیا

لبِ معجز بیاں نے چھین لیا
دل کا شعلہ زباں نے چھین لیا

دل مرا شب چراغ تھا جس کو
مژۂ خوں چکاں نے چھین لیا

عمر بھر کی مسرّتوں کا خمار
خلشِ ناگہاں نے چھین لیا

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئی
سب مزا رفتگاں نے چھین لیا

ہر گھڑی آسماں کو تکتا ہوں
جیسے کچھ آسماں نے چھین لیا

باغ سنسان ہو گیا ناصر
آج وہ گل خزاں نے چھین لیا

ناصر کاظمی



مایوس نہ ہو اداس راہی

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبح گاہی
اے منتظرِ طلوعِ فردا
بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اُٹھائیں گے سر
مٹنے کو ہے نازِ کج کلاہی
انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر داد طلب ہے بے گناہی
پھر اہلِ وفا کا دور ہو گا
ٹوٹے گا طلسمِ جم نگاہی
آئینِ جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

ناصر کاظمی



محرومِ خواب دیدۂ حیراں نہ تھا کبھی

محرومِ خواب دیدۂ حیراں نہ تھا کبھی
تیرا یہ رنگ اے شبِ ہجراں نہ تھا کبھی

تھا لطفِ وصل اور کبھی افسونِ انتظار
یوں دردِ ہجر سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی

پرساں نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں
ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی

ہر چند غم بھی تھا مگر احساسِ غم نہ تھا
درماں نہ تھا تو ماتمِ درماں نہ تھا کبھی

دن بھی اُداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

دورِ خزاں میں یوں مرا دل بے قرار ہے
میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

بے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات
جینا اگرچہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی

ناصرؔ کاظمی



مدّت ہوئی کہ سیر چمن کو ترس گئے

مدّت ہوئی کہ سیر چمن کو ترس گئے
گُل کیا غبارِ بوئے سمن کو ترس گئے

!ہاں اے سکوتِ تشنگیِ درد کچھ تو بول
کانٹے زباں کے آبِ سخن کو ترس گئے

دل میں کوئی صدا ہے نہ آنکھوں میں کوئی رنگ
تن کے رفیق صحبتِ تن کو ترس گئے

اس عہدِ نو میں ودرِ متاعِ وفا نہیں
اس رسم و راہِ عہدِ کہن کو ترس گئے

منزلوں کی ٹھنڈکوں نے لہو سرد کر دیا
جی سست ہے کہ پاؤں چبھن کو ترس گئے

اندھیر ہے کہ جلوۂ جاناں کے باوجود
کوچے نظر کے ایک کرن کو ترس گئے

ناصر کاظمی



مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے

مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے
مگر جینے کی صورت تو رہی ہے

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

چل دل سے امیدوں کی مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

نہ سمجھو تم اسے شور بہاراں
خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر کاظمی



ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے

ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
گو باغباں یہ کنجِ چمن مجھ سے چھین لے

گر احترامِ رسمِ وفا ہے تو اے خدا
یہ احترامِ رسمِ کہن مجھ سے چھین لے

منظر دل و نگاہ کے جب ہو گئے اداس
یہ بے فضا علاقۂ تن مجھ سے چھین لے

گل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ
گل چیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے

سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
!کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے

ناصر کاظمی



موسمِ گلزارِ ہستی ان دنوں کیا ہے نہ پوچھ

موسمِ گلزارِ ہستی ان دنوں کیا ہے نہ پوچھ

تو نے جو دیکھا سنا کیا میں نے دیکھا ہے نہ پوچھ

ہاتھ زخمی ہیں تو پلکوں سے گلِ منظر اٹھا

پھول تیرے ہیں نہ میرے باغ کس کا ہے نہ پوچھ

رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا

قافلے والوں میں کس کو کس کی پروا ہے نہ پوچھ

جو ترا محرم ملا اس کو نہ تھی اپنی خبر

شہر میں تیرا پتہ کس کس سے پوچھا ہے نہ پوچھ

ناصر کاظمی



میں نے جب لکھنا سیکھا تھا

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

تو نے کیوں مترا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا

پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

تیرے گھر کے دروازے پر
سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

ناصر کاظمی



میں ہوں رات کا ایک بجا ہے

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

آج تو یوں خاموش ہے دنیا
جیسے کچھ ہونے والا ہے

کیسی اندھیری رات ہے دیکھو
اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے

آج تو شہر کی روش روش پر
پتوں کا میلہ سا لگا ہے

آو گھاس پہ سبھا جمائیں
میخانہ تو بند پڑا ہے

پھول تو سارے جھڑ گئے لیکن
تیری یاد کا زخم ہرا ہے

تو نے جتنا پیار کیا تھا
دکھ بھی مجھے اتنا ہی دیا ہے

یہ بھی ہے ایک طرح کی محبت
میں تجھ سے تو مجھ سے جدا ہے

یہ تری منزل وہ مرا رستہ
تیرا میرا ساتھ ہی کیا ہے

میں نے تو اک بات کہی تھی
کیا تو سچ مچ روٹھ گیا ہے

ایسا گاہک کون ہے جس نے
سکھ دے کر دکھ مول لیا ہے

تیرا رستہ تکتے تکتے
کھیت گگن کا سوکھ چلا ہے

کھڑکی کھول کے دیکھ تو باہر
دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے

ساری بستی سو گئی ناصر
تو اب تک کیوں جاگ رہا ہے

ناصر کاظمی

نئے دیس کا رنگ نیا تھا

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش مِلا تھا

دُور کے دریاؤں کا سونا
ہرے سمندر میں گِرتا تھا

چلتی ندیاں ، گارے نوکے
نوکوں میں اِک شہر بسا تھا

نوکے ہی میں رَین بسیرا
نوکے ہی میں دن کٹتا تھا

نوکا ہی بچوں کا جُھولا
نوکا ہی پیری کا عصا تھا

مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی
نوکا لہروں میں اُلجھا تھا

ہنستا پانی، روتا پانی
مُجھ کو آوازیں دیتا تھا

تیرے دھیان کی کشتی لے کر
میں نے دریا پار کیا تھا

ناصر کاظمی



نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے

جس دھوپ کی دل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اسی کے ساتھ گئی

ان جلتی بلتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لیے

وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا

اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے

اب شہر میں اُس کا بدل ہی نہیں کوئی ویسا جانِ غزل ہی نہیں

ایوانِ غزل میں لفظوں کے گلدان سجاؤں کس کے لیے

مدت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا

ان خالی کمروں میں ناصر اب شمع جلاؤں کس کے لیے

ناصر کاظمی



نازِ بیگانگی میں کیا کچھ تھا

نازِ بیگانگی میں کیا کچھ تھا
حسن کی سادگی میں کیا کچھ تھا

لاکھ راہیں تھیں لاکھ جلوے تھے
عہدِ آوارگی میں کیا کچھ تھا

آنکھ کھلتے ہی چھپ گئی ہر شے
عالمِ بے خودی میں کیا کچھ تھا

یاد ہیں مرحلے محبّت کے
ہائے اس بے کلی میں کیا کچھ تھا

کتنے بیتے دنوں کی یاد آئی
آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا

کتنے مانوس لوگ یاد آئے
صبح کی چاندنی میں کیا کچھ تھا

رات بھر ہم نہ سو سکے ناصر
پردۂ خامشی میں کیا کچھ تھا

ناصر کاظمی



ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے

ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے

کل جو تھا وہ آج نہیں جو آج ہے وہ کل مٹ جائے گا
روکھی سوکھی جو مل جائے شکر کرو تو بہتر ہے

کل یہ تاب و تواں نہ رہے گی ٹھنڈا ہو جائے گا لہو
نامِ خدا ہو جوان ابھی کچھ کر گزرو تو بہتر ہے

کیا جانے کیا رت بدلے حالات کا کوئی ٹھیک نہیں
اب کے سفر میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو بہتر ہے

کپڑے بدل کر بال بنا کر کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

ناصر کاظمی



نِت نئی سوچ میں لگے رہنا

نِت نئی سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا

صحنِ مکتب میں ہم سِنوں کے ساتھ
سنگ ریزوں کو ڈھونڈتے رہنا

گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات
مِل کے باہم کہانیاں کہنا

دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی
رمِ آہو کو دیکھتے رہنا

ابر پاروں کو، سبزہ زاروں کو
دیکھتے رہنا، سوچتے رہنا

شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا

ریت کے پھول آگ کے تارے
یہ ہے فصلِ مراد کا گہنا

سوچتا ہوں کہ سنگِ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا

کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا

ناصر کاظمی



نصیب عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں

نصیب عشق دلِ بےقرار بھی تو نہیں
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

تلافیِ ستمِ روزگار کون کرے
تو ہم سخن بھی نہیں، راز دار بھی تو نہیں

زمانہ پرسشِ غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی تو نہیں

تو ہی بتا کہ تری خاموشی کو کیا سمجھوں
تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں

وفا نہیں نہ سہی، رسم و راہ کیا کم ہے
تری نظر کا مگر اعتبار بھی تو نہیں

!اگرچہ دل تری منزل نہ بن سکا اے دوست
مگر چراغِ سرِ رہگزار بھی تو نہیں

بہت فسردہ ہے دل، کون اس کو بہلائے
اُداس بھی تو نہیں، بے قرار بھی تو نہیں

ناصر کاظمی



نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے

نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے
بہاروں میں اب کی نئے گُل کھِلے

نہ جانے کہاں لے گئے قافلے
مسافر بڑی دور جا کر ملے

وہی وقت کی قید ہے درمیاں
وہی منزلیں اور وہی فاصلے

جہاں کوئی بستی نظر آ گئی
وہیں رک گئے اجنبی قافلے

تمھیں دل گرفتہ نہیں ساتھیو
ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گلے

ہمیں بھی کریں یاد اہلِ چمن
چمن میں اگر کوئی غنچہ کھِلے

ابھی اور کتنی ہے میعادِ غم
کہاں تک ملیں گے وفا کے صلے

ناصر کاظمی



نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

نہ ملا کر اداس لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں

آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

ناصر کاظمی



ہنستے گاتے روتے پھول

ہنستے گاتے روتے پھول
جی میں ہیں کیسے کیسے پھول

اور بہت کیا کرنے ہیں
کافی ہیں یہ تھوڑے پھول

وقت کی پھلواری میں نہیں
دامن میں ہیں ایسے پھول

اس دھرتی کی رونق ہیں
میرے کانٹے تیرے پھول

کیسے اندھے ہیں وہ ہاتھ
جن ہاتھوں نے توڑے پھول

اُن پیاسوں پر میرا سلام
جن کی خاک سے نکلے پھول

ایک ہری کونپل کے لیے
میں نے چھوڑے کتنے پھول

اونچے اونچے لمبے پیڑ
سادے پتے پیلے پھول

مٹی ہی سے نکلے تھے
مٹی ہو گئے سارے پھول

مٹی کی خوشبو لینے
نیل گگن سے اترے پھول

چادر اوڑھ کے شبنم کی
نکلے آنکھیں ملتے پھول

شام ہوئی اب گلیوں میں
دیکھو چلتے پھرتے پھول

سونا جسم سفید قمیص
گورے ہاتھ سنہرے پھول

کچی عمریں کچے رنگ
ہنس مکھ بھولے بھالے پھول

آنکھ آنکھ میں بھیگی نیند
ہونٹ ہونٹ سے جھڑتے پھول

گورے گورے ننگے پیر
جھلمل جھلمل کرتے پھول

جیسا بدن ویسا ہی لباس
جیسی مٹی ویسے پھول

مہک اٹھی پھر دل کی کتاب
یاد آئے یہ کب کے پھول

شام کے تارے تو ہی بتا
آج کدھر سے گزرے پھول

کانٹے چھوڑ گئی آندھی
لے گئی اچھے اچھے پھول

دھیان میں پھرتے ہیں ناصر
اچھی آنکھوں والے پھول

ناصر کاظمی

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

تیرے کرم سے اے المِ حسن آفریں
دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمھارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبّت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصر کاظمی



وا ہوا پھر درِ مے خانۂ گل

وا ہوا پھر درِ مے خانۂ گل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن
پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر کسی گل کا اشارہ پا کر
چاند نکلا سرِ مے خانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کل ترا دور تھا اے بادِ صبا
ہم ہیں اب سرخیِ افسانۂ گل

ناصر کاظمی



وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں

وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایانِ التماس نہیں

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب اُن دنوں کا تصوّر بھی میرے پاس نہیں

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مِٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

ناصر کاظمی



وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

میں اُن کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں مرے ادھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے کیاہوئے

وہ دل میں کھبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

ناصر کاظمی



یاد آتا ہے روز و شب کوئی

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

لبِ جو چھاؤں میں درختوں کی
وہ ملاقات تھی عجب کوئی

جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا
وہ بھی تھا موسمِ طرب کوئی

کچھ خبر لے کہ تیری محفل سے
دور بیٹھا ہے جاں بلب کوئی

نہ غمِ زندگی نہ دردِ فراق
دل میں یوں ہی سی ہے طلب کوئی

یاد آتی ہیں دور کی باتیں
پیار دے دیکھتا ہے جب کوئی

چوٹ کھائی ہے بارہا لیکن
آج تو درد ہے عجب کوئی

جن کو مِٹنا تھا مِٹ چکے ناصر
اُن کو رسوا کرے نہ اب کوئی

ناصر کاظمی



یاس میں جب کوئی آنسو نکلا

یاس میں جب کوئی آنسو نکلا
اک نئی آس کا پہلو نکلا

لے اُڑی سبزۂ خود رو کی مہک
پھر تری یاد کا پہلو نکلا

میٹھی بولی میں پپیہے بولے
گنگناتا ہوا جب تو نکلا

آئیں ساون کی اندھیری راتیں
کہیں تارا کہیں جگنو نکلا

نئے مضمون سُجھاتی ہے صبا
کیا ادھر سے وہ سمن بو نکلا

پاؤں چلنے لگی جلتی ہوئی ریت
دشت سے جب کوئی آہو نکلا

کئی دن رات سفر میں گزرے
آج تو چاند لبِ جو نکلا

طاقِ میخانہ میں چاہی تھی اماں
وہ بھی تیرا خمِ ابرو نکلا

اہلِ دل سیرِ چمن سے بھی گئے
عکسِ گل سایۂ گیسو نکلا

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

ناصر کاظمی



یہ بھی کیا شامِ ملاقات آئی

یہ بھی کیا شامِ ملاقات آئی
لب پہ مشکل سے تیری بات آئی

صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب
ہائے کیا ہوگا اگر رات آئی

بستیاں چھوڑ کے برسے بادل
کس قیامت کی یہ برسات آئی

کوئی جب مل کے ہوا تھا رخصت
دلِ بے تاب وہی رات آئی

سایۂ زلفِ بتاں میں ناصر
ایک سے ایک نئی رات آئی

ناصر کاظمی



یہ خوابِ سبز ہے یا رت وہی پلٹ آئی

یہ خوابِ سبز ہے یا رت وہی پلٹ آئی
چھتوں پہ گھاس ہوا میں نمی پلٹ آئی

کچھ اس ادا سے دُکھایا ہے تیری یاد نے دل
وہ لہر سی جو رگ و پے میں تھی پلٹ آئی

تری ہنسی کے گلابوں کو کوئی چھو نہ سکا
صبا بھی چند قدم ہی گئی، پلٹ آئی

خبر نہیں وہ مرے ہمسفر کہاں پہنچے
کہ رہگزر تو مرے ساتھ ہی پلٹ آئی

کہاں سے لاؤ گے ناصر وہ چاند سی صورت
گر اتفاق سے وہ رات بھی پلٹ آئی

ناصر کاظمی



یہ رات تمھاری ہے، چمکتے رہو تارو

یہ رات تمھاری ہے، چمکتے رہو تارو
وہ آئیں نہ آئیں، مگر امید نہ ہارو

شاید کسی منزل سے کوئی قافلہ آئے
آشفتہ سرو صبح تلک یوں ہی پکارو

دن بھر تو چلے اب ذرا دم لے کے چلیں گے
اے ہم سفرو آج یہیں رات گزارو

یہ عالمِ وحشت ہے تو کچھ ہو کے رہے گا
منزل نہ سہی، سر کسی دیوار سے مارو

اوجھل ہوئے جاتے ہیں نگاہوں سے دو عالم
تم آج کہاں ہو غمِ فرقت کے سہارو

کھویا ہے اسے جس کا بدل کوئی نہیں ہے
یہ بات مگر کون سنے، لاکھ پکارو

ناصر کاظمی



یہ رنگِ خوں ہے گلوں پر نکھار اگر ہے بھی

یہ رنگِ خوں ہے گلوں پر نکھار اگر ہے بھی
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی

یہ پیش خیمۂ بیدادِ تازہ ہو نہ کہیں
بدل رہی ہے ہوا سازگار اگر ہے بھی

لہو کی شمعیں جلاؤ قدم بڑھاتے چلو
سروں پہ سایۂ شب ہائے تار اگر ہے ابھی

ابھی تو گرم ہے میخانہ جام کھنکاؤ
بلا سے سر پہ کسی کا ادھار اگر ہے بھی

حیاتِ درد کو آلودۂ نشاط نہ کر
یہ کاروبار کوئی کاروبار اگر ہے بھی

یہ امتیاز من و تو خدا کے بندوں سے
وہ آدمی نہیں طاعت گزار اگر ہے بھی

نہ پوچھ کیسی گزرتی ہے زندگی ناصر
بس ایک جبر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی

ناصر کاظمی



یہ شب یہ خیال و خواب تیرے

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

ناصر کاظمی



یہ کہہ رہا ہے دیارِ طرب کا نظّارا

یہ کہہ رہا ہے دیارِ طرب کا نظّارا
یہیں ملے گا مجھے میرا انجمن آرا

خیالِ حسن میں کتنا بہار پرور ہے
شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظّارا

چلے تو ہیں جرسِ گل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

چلو کہ برف پگھلنے کی صبح آ پہنچی
خبر بہار کی لایا ہے کوئی گُل پارا

چلے چلو انھیں گم نام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مل جائے درد کا چارا

کسے مجال کہ رُک جائے سانس لینے کو
رواں دواں لیے جاتا ہے وقت کا دھارا

بگولے یوں اُڑے پھرتے ہیں خشک جنگل میں
تلاشِ آب میں جیسے غزالِ آوارا

ہمیں وہ برگِ خزاں دیدہ ہیں جنھیں ناصر
چمن میں ڈھونڈتی پھرتی ہے بوئے آوارا

ناصر کاظمی

